Al 3/214

ستاروں سے ذرّوں تک

ستاروں سے ذرّوں تک

جگن ناتھ آزاد

GOVT GIRLS COLLEGE
ACC
LIBRARY
11605
11605

مکتبۂ شاہراہ • دہلی

861

دوسری بار ۱۰۰۰

نعمانی پریس دہلی

قیمت :- دو روپے بارہ آنے

ترتیب

پیش لفظ

جب ہندوستان میں اُردو کا زوال شروع ہُوا تو میرا پہلا مجموعۂ کلام "بیکراں" منظرِ عام پر آیا۔ ایسے عالم میں جب کہ اُردو ملک کے سماجی اور ثقافتی ماحول میں آخری سانس لے رہی ہو اہلِ ملک کے سامنے نظموں کا مجموعہ پیش کرنا ایک عجیب جُرأتِ رِندانہ تھی۔ نہ جانے مَیں نے کس جذبے کے تحت اس جرأت رندانہ سے کام لیا اور ایک روا روی کے عالم میں اپنی منظومات

کو جمع کر کے اہلِ نظر کی خدمت میں پیش کر دیا۔

اگرچہ شعر کہنے کا شوق مجھے بچپن سے ہے لیکن تقسیم ہند تک مَیں نے شعر کہنے کی طرف کوئی خاص توجّہ نہیں کی تھی، اور اسے تاش کھیلنے یا سینما دیکھنے سے زیادہ اہمیت کبھی نہیں دی تھی۔ 'بیکراں' ضخامت کے اعتبار سے ایک چھوٹی سی کتاب ہے اور اس میں کم و بیش وہ تمام نظمیں اور غزلیں وغیرہ موجود ہیں جو مَیں نے گذشتہ دس برس کی مُدّت میں کہیں۔

'بیکراں' کو ہندوستان اور پاکستان میں جس انداز سے پسند کیا گیا اُس نے مجھے اتنا یقین دلا دیا کہ مَیں نے اِس دَور میں یہ مجموعہ پیش کر کے کوئی غلطی نہیں کی بلکہ ایک صحیح قدم اُٹھایا ہے اور یہی خیال زیرِ نظر کتاب کے پیش کرنے کا محرک ثابت ہوا ہے۔

نوا از حوصلۂ دوستاں بلند تر است
غزل سرا شدہ ام آنجا کہ ہیچ کس نشنید

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اگست ۱۹۴۷ء تک شعر گوئی کے ساتھ میرا تعلّق سرسری اور گاہے گاہے کی ملاقات کا سا تھا اور ادب برائے زندگی کی تحریک نے بھی جو ہندوستان میں ۱۹۴۰ء کے بعد خاصا زور پکڑ گئی تھی مجھے اپنی طرف کچھ خاص متوجّہ نہیں کیا تھا۔

لیکن نہ جانے ۱۹۴۷ء کے کشت و خون اور اس کے بعد پیدا ہونے والے واقعات میں کیا بات پنہاں تھی کہ ایک بجلی کی طرح میرے ذہن پر چمکے اور ہمیشہ کے لئے اپنا اثر چھوڑ گئے۔ مجھے یُوں محسوس ہوا کہ جذبات و خیالات کے بند چشمے تھے کہ اشارہ پاتے ہی پھُوٹ پڑے ہیں۔ ایک برف زار تھا جو مہرِ نیمروز کی حِدّت کا محتاج تھا اور جب اُس کی بھرپُور کرنوں سے دوچار ہوا تو ایک سیلاب بن کر بہ نکلا۔

ایک طویل نیند کے بعد میری آنکھیں کھُلی تھیں اور اب اِن

آنکھوں کا ذوقِ تماشا بذاتِ خود ایک تماشا تھا۔ میں نے ہندوستان پاکستان، ایشیا اور یورپ میں نمودار ہونے والے واقعات کو بڑی دلچسپی، بڑی حیرت، بڑی مسرّت، بڑے غم، بڑے شوق اور بڑی ندامت کے ساتھ دیکھا اور جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اُسے اس مقصد کے پیشِ نظر بیان کیا کہ اب خاموش رہنا کوتاہی ہے اور کامیابی ہو یا نہ ہو انسانیت کے سمندر میں جس قدر بھی ممکن ہو —— چاہے ایک قطرے کا یا اُس سے کم ہی کیوں نہ ہو —— اضافہ کرنا اپنا فرض ہے۔

چنانچہ اس کے بعد میں نے جو کچھ لکھا اسی جذبے کے تحت اور اسی مقصد کے پیشِ نظر۔ بکھریاں ۱۹۴۹ء کے آخر میں چھپی۔ اس کے اوراق میں اس جذبے کی جھلک اکثر مقامات پر نظر آتی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ وہ جھلک خواہ نظم کے لباس میں ہے یا غزل کے پردے میں، اہلِ نظر کی نگاہوں

سے پوشیدہ نہیں رہی۔ زیرِ نظر کتاب ۱۹۴۹ء کے آخری چند مہینوں اور ۱۹۵۰ء کے ابتدائی چند مہینوں میں کہی ہوئی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔

جب اس کتاب کو مرتّب کرنے کا سوال زیرِ غور آیا اور نام کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو سب سے پہلے "خاوراں" ذہن میں آیا اس کے بعد "ستاروں سے ذرّوں تک"۔ "خاوراں" میں شعریت تھی گہرائی تھی، وسعت تھی۔ اس کے برعکس "ستاروں سے ذرّوں تک" میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ یہ نام کچھ افسانوی طرز کا نظر آیا اور نظم و غزل کے مجموعے کے لئے کسی حد تک غیر موزوں بھی، لیکن چونکہ یہ نام میری شاعری کے ارتقا پر بہت حد تک روشنی ڈالتا تھا اس لئے میں نے اس مجموعے کے لئے اسے ہی منتخب کیا۔ میری شاعری جو

پھولوں سے بہاروں سے ستاروں سے گزر جا
ہے دُور کہیں ذوقِ نظر تیرا ٹھکانہ

اور

چاند تارے اب تو گردِ راہ میں گم ہو گئے
کون سی منزل کے عازم ہیں دلِ دیوانہ ہم
سے چلی تھی اب

آسماں کے اَوج سے افکار کو واپس بُلا
یہ زمیں سب کچھ ہے ناداں! آسماں کچھ بھی نہیں

اور

زمیں سے دُور تاروں پر نگاہیں ڈالنے والے ○
خبر بھی ہے کہ یہ خاکی کرہ بھی اِک ستارہ ہے

کی اور قریب ایسی ہی منزلوں میں پہنچ چکی تھی لہذا میں نے "خاوراں" کے مقابلے میں ایک غیر شاعرانہ نام "ستاروں سے ذرّوں تک"

○ یہ مضمون مجھے صحیح یاد نہیں کس کا ہے۔ میرا طبعزاد نہیں غالباً گورکی سے لیا ہے

کو ترجیح دی اور یہ مجموعہ اسی نام سے شائع ہو رہا ہے۔ "خاوراں" بھی مجھے پسند ہے اور ممکن ہے مَیں اپنے نئے مجموعۂ کلام کے لئے پھر اسی نام کو منتخب کر لُوں۔

شاعری کے متعلق کسی زمانے میں مَیں بھی یہی سمجھتا تھا کہ یہ ایک الہامی چیز ہے اور آسمان یا اس سے بھی اُونچی بلندیوں سے یہ دلِ شاعر پر نزول کرتی ہے اور وہاں سے صفحۂ قرطاس پر لیکن اب داخلی اور خارجی واردات نے میرے اس نظریے کو ختم کر دیا ہے۔ اب شعر کہنے کے لئے میں اس آسمانی برکت کا منتظر نہیں رہتا بلکہ اب تو جو کچھ دیکھتا ہوں، سنتا ہُوں اور محسوس کرتا ہوں اُسی سے متاثر ہو کر شعر کہتا ہوں اور کوشش یہی رہتی ہے کہ بے مقصد شاعری سے اپنا دامن بچائے رکھوں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مَیں نے ہر شعر افادیت کے نقطۂ نگاہ سے کہا ہے۔ جس ماحول میں میری پرورش ہوئی ہے

اُس کے اثر سے نہ میں آزاد ہوں نہ میری شاعری۔ میرے سامنے جہاں نئے رُحجانات ہیں وہاں مشرق کا کلاسیکی ادب اور اُس کی عظمت بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں اور پھر زندگی کا جمالیاتی پہلو اپنی تمام رعنائیاں لئے ہوئے میرے سامنے مَوجود ہے اس لئے اگر میرے اس مجموعے میں بھی کہیں کہیں غمِ جاناں کی داستان نظر آجاتی ہے تو یہ زندگی کی حقیقتوں سے فرار ہے نہ ہی اپنے نظریے کی مخالفت بلکہ اس کے متعلق مجھے یہی کہنا ہے کہ ؎

"عشق است و ہزار افسوں، حُسن است و ہزار آئیں
نے مَن بہ شمار آئم، نے تُو بہ شمار آئی"

ایک بات اور، اور وہ اُس غم کے متعلق ہے جسے نہ غمِ جاناں کہہ سکتے ہیں نہ غمِ دوراں یہ ایک تیسرا غم ہے نہ جانے یہ کس کا غم ہے اور کیوں پیدا ہوا لیکن جب سے

ہوش سنبھالا اسے اپنی سرشت میں پایا۔ اس غم کا مداوا کیا ہے اس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ غم ایک عجیب قسم کی بے بسی کا خلّاق ہے اور اس بے بسی میں ایک ایسی کیفیت پنہاں ہے جس کی بدولت یہ غم مجھے غمِ جاناں یا غمِ دوراں سے کم محبوب نہیں۔

آزاد

دہلی
مئی ۱۹۵۰ء

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اقبال

میرا موضوعِ سخن

تُجھ کو مجھ سے یہ گِلہ ہے کہ مرا فکرِ جمیل
بھاگ نکلا ہے تخیّل کے سمن زاروں سے
مَیں نے ڈھونڈی ہے، زمانے کے اندھیروں میں پناہ
دُور گردوں کے دَمکتے ہوئے سیّاروں سے
مرے افکار نے اب توڑ لیا ہے رشتہ
ابر کے کیف سے مہتاب کے نظّاروں سے

کوئی دل، کوئی نظر آج تو مجروح نہیں
مرے نغموں کی لچکتی ہوئی تلواروں سے

تری تنقید مرے فن پہ بجا ہے لیکن
شور برپا ہو تو انسان نہیں سو سکتا
جب تک اے دوست! یہی ہے مری دُنیا کا نظام
مرا موضوع بھی تبدیل نہیں ہو سکتا
فقط اک مُردہ و بے رنگ تنوّع کے لئے
اپنے مقصد کو مرا فکر نہیں کھو سکتا
باغ میں پھول کے کھلنے کی تمنّا لے کر
اپنے ہاتھوں سے مَیں کانٹے تو نہیں بو سکتا

یہ بجا ہے کہ مری حُسن پسند آنکھوں کو
ناپسند آج ہے مہتاب کا تاروں کا جمال
یہ بجا ہے کہ مرے فکرِ سخن کی زد میں
اب نہ رنگینیٔ مغرب ہے نہ ہے بادِ شمال
ایک نقطے پہ ہے مرکوز مرا ذوقِ سخن
ایک ہی ڈھب پہ رواں ہے مرا اندازِ خیال
ظلمتیں نُور سے جب دست و گریباں ہو جائیں
پھر کہاں حُسن و تجلّی کی لطافت کا سوال

حرف گیری تو مرے فن پہ ہے آسان، مگر
کس قدر درہم و برہم ہے جہاں یہ بھی تو دیکھ
جس گلستاں کو بہاروں کی تمنّا تھی وہاں

دندناتی ہوئی آئی ہے خزاں یہ بھی تو دیکھ

ہم کو نعمات کے انوار کا تھا شوق مگر

چھا گیا چرخ پہ آہوں کا دُھواں یہ بھی تو دیکھ

جہل کی قدر تو اس وقت بھی ہے چار طرف

علم کا کوئی نہیں مرتبہ داں یہ بھی تو دیکھ

تھی زبانوں پہ "تمدّن کی حفاظت" لیکن

مِٹ گیا آج تمدّن کا نشاں یہ بھی تو دیکھ

ہائے تقصیر اُن آنکھوں میں کہ تھیں مہر فروش

ہو گئی بند مروّت کی دُکاں یہ بھی تو دیکھ

جس کو نعمات سمجھتے ہیں زمانے والے

وہ حقیقت میں ہے فریاد و فغاں یہ بھی تو دیکھ

اب بھی سرمائے کے ہاتھوں وہی پہلے کی طرح

تیغ ہے گردنِ محنت پہ رواں یہ بھی تو دیکھ
جس طرح رات کو مفقود ہو خورشید کا نور
آج مفقود ہے یوں امن واماں یہ بھی تو دیکھ

تو مری طرح اگر دہر کا نظّارہ کرے
آدم آدم کا شکاری نظر آئے تجھ کو
آج اخلاص کے ہیں جس کی زباں پہ دعوے
وہی نفرت کا پجاری نظر آئے تجھ کو
سب سے آگے ہے جو یزداں کی پرستاری میں
وہی شیطاں کا حواری نظر آئے تجھ کو
سیم و زر میں اُدھر انسان کو تُلتا دیکھے
اِدھر انسان بھکاری نظر آئے تجھ کو

تو یہ کہتا ہے کہ دُھندلی سہی تاریک سہی
جلوہ گر پھر بھی فضاؤں میں سحر ہے کہ نہیں
مَیں یہ کہتا ہوں کہ پھر رات کہیں گے کس کو
مجھ کو حیرت ہے تجھے ذوقِ نظر ہے کہ نہیں

یہ سحر خُون کا پرتو ہے تجلّی کا نہیں
دیدۂ شوق ترا ژرف نگر ہے کہ نہیں
تُو سمجھتا ہے کہ ہے قافلہ منزل بہ نگاہ
پُوچھتا ہُوں مَیں یہ بے قصد سفر ہے کہ نہیں

قافلے والوں پہ اغیار ہیں محوِ یلغار
تجھ کو اس بات کی اے دوست خبر ہے کہ نہیں

عدل و انصاف کے دعوے وُہ مساوات کے راگ

ہو گئے کون سے پردوں میں نہاں آخرکار
اب کہاں ہیں وُہ بغاوت کے پھریروں والے
پُوچھتا ہے بڑی حیرت سے ہر اک راہگذار
جُھک گیا سطوتِ شاہانہ کے آگے کیوں کر
مُلک کے اہلِ بغاوت کا فقیرانہ وقار
کاش بُجھتا نہ کبھی سرد ہوا کے آگے
وُہ دلوں میں کبھی چمکا تھا جو غیرت کا شرار

کیا اسی دن کے لئے ہم نے دُعا مانگی تھی
کہ خزاں سے رہے محفوظ گلستانِ وطن
کیا اسی دن کے لئے باندھ کے نکلے تھے کفن
موت کو جان کے اک کھیل جوانانِ وطن

کیا اسی دن کے لیئے قید میں سڑ سڑ کے مرے
دورِ افرنگ کے دُشمن وہ محبّانِ وطن

کیا تماشا ہے کہ آوارہ پھریں محنت کش
اور مسند پہ نظر آئیں تن آسانِ وطن

آج بھی غیر کی تعمیر کے کام آتی ہے
وائے بر خستگیٔ خاکِ پریشانِ وطن

اُن کے دل پر تجھے معلوم بھی ہے کیا گزرے
ایک پل کو بھی جو لوٹ آئیں شہیدانِ وطن

اُن کی آنکھیں جو یہ مجروح بہاریں دیکھیں
اپنے گھر میں اُنہیں بسنے کی تمنّا نہ رہے
قعرِ پستی میں جو یوں مُلک کو گرتا دیکھیں

کوئی بھی اُن کی اُمیدوں کا سہارا نہ رہے

اُن کی آنکھیں جو یہ تاریک مناظر دیکھیں

اُن کی آنکھوں میں ذرا بھی تو اُجالا نہ رہے

ایک بار آ کے تماشائے وطن دیکھ جو لیں

اُن کے سینوں میں ذرا ذوقِ تماشا نہ رہے

ہم یہی سمجھیں کہ ابنائے وطن کے دل سے

ان شہیدوں کو فراموش ہوئے دیر ہوئی؟

اُن شہیدوں کی تمنّا کو کریں گے پُورا

رہنماؤں کو یہ پیمان کئے دیر ہوئی

شمعِ اخلاص فروزاں تو ہوئی تھی، لیکن

آج اس شمع کو محفل میں بُجھے دیر ہوئی

لائیں گے مُلک میں سُلطانی جمہور کا دَور

گوشِ جمہور کو یہ نعرہ سُنے دیر ہوئی

کیا یہی سمجھیں کہ وُہ حُبّ ِ وطن کی محفل

محفلِ وہم تھی اب اُس کو مِٹے دیر ہوئی؟

اپنے انجام کو دیکھیں جو تمنّائیں قریب

پھر تمنّاؤں میں ہیجان بپا ہو کہ نہ ہو

اہلِ طاقت کے جو اطوار یہی ہوں تو بتا

اعتراضات کا طُوفان بپا ہو کہ نہ ہو

یہی محفل ہے تو پھر برہمیِٔ محفل کا

دلِ بے تاب میں ارمان بپا ہو کہ نہ ہو

بزم کو اپنی جو تقدیر بگڑتی نظر آئے

بزم میں حشر کا سامان بپا ہو کہ نہ ہو

بات کرنے میں غلامی کا یہ انداز تو چھوڑ
حُرّیت کا مجھے افسانہ سُنانے والے

دامنِ فکر کو تو پنجۂ ظلمت سے چھُڑا
رات کو صبح درخشندہ بتانے والے

کیسے معلوم ہو تجھ کو کہ حقیقت کیا ہے
پردہ آنکھوں پہ عقیدت کا گرانے والے

خامئ شعر مری ہے کہ تری خامئ فہم
چند لفظوں میں صداقت کو چھپانے والے

گرد دامن سے غلامی کی چھُڑانے والے

ترے ماتھے پہ غلامی کا نشاں آج بھی ہے

جو سماں تیری نگاہوں سے نہاں ہے شاید
وہ سماں میری نگاہوں پہ گراں آج بھی ہے

نو بہاروں کا فسوں دیکھ کے مسحور نہ ہو
نو بہاروں کے تعاقب میں خزاں آج بھی ہے

آج بھی روح میں ہے درد کی دُنیا آباد
دم بخود کا پنتے ہونٹوں پہ فغاں آج بھی ہے

آج بھی دل میں ہیں بے تابِ تکلّم نالے
اور سینے میں دلِ زار طپاں آج بھی ہے

جلوہ فرمائی پہ حُسن آج بھی آمادہ نہیں
عشق کی ڈُوبتی نظروں میں فغاں آج بھی ہے

آج بھی دیدۂ افکار پہ پردے ہیں محیط

حل طلب مسئلۂ سُود و زیاں آج بھی ہے

عندلیب آج بھی گُلنار میں ہے محوِ فغاں

دردِ ہر پھُول کے سینے میں نہاں آج بھی ہے

رنگ محفل کا بدلتا نظر آتا ہی نہیں

ایک کا سُود ہزاروں کا زیاں آج بھی ہے

آج بھی بندہ و آقا میں تفاوت ہے وُہی

دیدۂ عدل مہر سو نگراں آج بھی ہے

آج بھی شور فضا میں ہے وہی محنت کا

گوشِ سرمایہ پہ یہ شور گراں آج بھی ہے

کون اِس دَور میں ماحول کا ہو شکوہ طراز

نطق پر دشنۂ احکام رواں آج بھی ہے

تُو جو کہتا ہے کہ یہ دَور ہے انصاف کا دَور
اِتنی نایاب پھر انصاف کی دولت کیوں ہے

اب تو اپنوں کا ہے اغیار کا یہ دَور نہیں
آج پھر نام پہ مذہب کے تجارت کیوں ہے

کارخانوں میں ہے کیوں آج بھی محنت مجبُور
اتنی مغرُور و جفاکیش امارت کیوں ہے

آدمیّت سے ہے کیوں آدمی بیگانہ ابھی
آدمی ہے تو نظر میں یہ رعونت کیوں ہے

عدل و انصاف و صداقت کا زمانہ ہے تو پھر
عدل گاہوں میں یہ ہنگامۂ رشوت کیوں ہے

گر ترے پاس نہیں میرے سوالوں کا جواب
تجھ کو پھر اپنے عقائد سے محبّت کیوں ہے

چشمِ بینا ہے تو ماحول کا نظارہ کر
رنگ ماحول کے چہرے سے اُترتا ہُوا دیکھ

دیکھ بگڑے ہُوئے اقبال کے تیور اے دوست
اور ادبار کو ہر سمت سنورتا ہُوا دیکھ

واہ کیا نظم ہے جنتا سے ہے پُر ریل کی چھت
اس میں دو چار کو گرتا ہُوا مرتا ہُوا دیکھ

موسمِ سرد کی راتوں میں کُھلی سڑکوں پر
موت کے گھاٹ غریبوں کو اُترتا ہُوا دیکھ

اور گرمی میں جو کیمپوں میں پڑے ہیں اُن کو
بزمِ ہستی کی کشاکش سے گزرتا ہُوا دیکھ

کیا نئے دَور میں ہے عدل اسی چیز کا نام

کہ ہو راکب بھی بشر اور ہو مرکب بھی بشر

کس لُغت میں ہے یہ مفہومِ مساوات کہ ہوں
مرے دامن میں خذف اَور کے دامن میں گُہر

جا بجا آبِ مُصفّا کے رواں ہوں چشمے
اور قطروں کو ترستی رہے انساں کی نظر

راستے کی ہے خبر اور نہ منزل کا پتہ
ہائے کس دُھن میں مرا قافلہ ہے گرمِ سفر

اپنی دُنیا کے الم ناک اندھیروں سے پرے
محو ہے کون سے عالم میں ترا فکرِ مُنیر

ہر طرف ایک سا عالم نظر آتا ہے مجُھے
ایسی ذِلّت ہے کہ ملتی ہی نہیں جس کی نظیر

کس کی ناموس جہاں میں سرِ بازار لُٹی
کس کے حصّے میں پڑے افسر و اورنگ و سریر

کون اس راز کو اس دور میں اب فاش کرے
ایک کی بند زباں ایک کا مجرم ہے ضمیر

جب یہ عالم ہو تو اے دوست مرا فکرِ جمیل
سیرِ گلزار سے ہو سکتا ہے دل شاد کہیں؟
خونِ تہذیب کے سینے سے رواں دیکھ کے بھی
مَیں رہوں ساکت و خاموش یہ کیا جرم نہیں
مجھ کو اس بات سے انکار نہیں ہے اے دوست!
کہ گھٹائیں ہیں طرب ناک ستارے ہیں حسیں
اور مرے دیدۂ مشتاق کا رستہ روکے

زہرہ پیکر جو کہیں ہیں تو کہیں ماہ جبیں

اہلِ گلزار بھی جب اپنی نظر بہلائیں
صحنِ گلزار کے پھولوں سے نہیں خاروں سے
پھر تجھے کیوں یہ گلہ ہے کہ مرا فکرِ جمیل
بھاگ نکلا ہے تخیّل کے سمن زاروں سے

مَیں نے ڈھونڈی ہے زمانے کے اندھیروں میں پناہ
دُور گردوں کے دمکتے ہوئے سیّاروں سے
مرے افکار نے اب توڑ لیا ہے رشتہ
ابر کے کیف سے مہتاب کے نظّاروں سے

کوئی دل کوئی نظر آج تو مجروح نہیں
مرے نغموں کی لچکتی ہوئی تلواروں سے

(۲)

ایک ہی رنگ دکھایا ہے ابھی تک مَیں نے
ایک رنگ اور بھی اس پیکرِ تصویر کا ہے
اور تصویر کا یہ رنگ بیاں کی خاطر
نہ ہے محتاج ترانے مری تقریر کا ہے
یہ ہے وہ رنگ کہ ہے جس میں تجلّیٔ افق
اثر اس میں ابدی حُسن کی تنویر کا ہے
اہلِ ڈالر کی اُمیدوں کا لہو ہے اس میں
ساتھ ہی خون کچھ انگریز کی تدبیر کا ہے

گرچہ انساں ہے زبوں حال مگر مَیں اے دوست!
دَورِ مستقبلِ انساں سے نہیں ہوں مایُوس

مجھ کو امید بہت ابرِ گہربار پہ ہے
مَیں ابھی خاکِ گلستاں سے نہیں ہوں مایوس
گرچہ بکھرا ہُوا سامان ہے میخانے کا
مَیں اِس اندازکے ساماں سے نہیں ہوں مایوس

اب نگاہوں میں ہے اک عالمِ نَو کی تعمیر
اب نگاہوں میں تخیّل کے سمن زار نہیں
سرِ شوریدہ میں ہے فکرِ وطن کا سودا
دیدہ و دل کو غمِ ہجر کا آزار نہیں
فن کی تخلیق میں مصروف رہوں فن کے لئے
اب کسی طور مَیں اس بات پہ تیّار نہیں
مَیں کہ فن کار ہوں تبلیغ بھی ہے کام مرا

مجھ کو اس بات کے اظہار سے کچھ عار نہیں

چرخ پر ایک تجلّی نظر آتی ہے مجھے
جس سے شاید کہ ترا ذوق ابھی مانوس نہیں

یہ ضیا پھیلتی جاتی ہے زمیں پر ہر سُو
فطرت آزاد ہے اس نُور کی محبوس نہیں

کرنیں اس نُور کی ایسی ہیں کہ واقف اُن سے
نَے اذانوں کی نہیں نغمۂ ناقوس نہیں

اِس تجلّی کو نہ کم جان نظر کھول کے دیکھ
ابَدی نُور ہے انگریز کا فانوس نہیں

کوئی اس نُور کو دیکھے کہ نہ دیکھے اے دوست!

نوُر والوں کا زمانہ تو نہیں رُک سکتا

لبِ جمہور پہ اِس وقت جو ہے رقص کُناں

حُرّیت کا وہ ترانہ تو نہیں رُک سکتا

محفلِ درد میں افلاس نے چھیڑا ہے جسے

وُہ طرب ناک فسانہ تو نہیں رُک سکتا

بزمِ کُہنہ کو ہے اب ایک بہانہ درکار

وُہ اُجڑنے کا بہانہ تو نہیں رُک سکتا

وقت کے ساتھ جو دو ہاتھ کرے گا کوئی

وقت کے ایک ہی سیلاب میں بہ جائے گا

دَورِ جمہور میں جمہور سے لڑنے والا

صُورتِ حرفِ غلط دہر سے مٹ جائے گا

شورشِ محفلِ عالم نہ سمجھنے والا

اَبدی نیند کے دامن میں سکوں پائے گا

وقت کی تندئ سیلاب نہ چھوڑے گی اُسے

آج جو وقت کے سیلاب سے ٹکرائے گا

اِسی سیلاب سے دُھل جائے گا روئے گیتی

خود بخود ایک نیا دَور نظر آئے گا

یہ نیا دَورِ جہاں دورِ مسرّت بن کر

پیرہن دہر کو انصاف کا پہنائے گا

یہ تفاوت کا زمانہ نہ رہے گا باقی

اور خوش بختئ افراد کا وقت آئے گا

ختم ہو جائے گا تقدیر کا موہوم فریب

آدم اس دَور میں کردار پہ اترائے گا

مرے اشعارِ جنوں خیز میں ہے جس کی چمک

نورِ وہ چہرۂ انساں پہ نظر آئے گا

فسقِ سرمایہ پہ محنت کا تقدّس ٹُٹ جائے

یہ سماں دیدۂ انساں کو نہ نڑ پائے گا

وُہ اخوّت جو کتابوں میں نظر آتی ہے

اُس کا اب نورِ سرِ بزم نظر آئے گا

عالمِ پاک میں فردوس کوئی ہے تو اُسے

خاک اور خاک کی تقدیر پہ رشک آئے گا

اس زمانے میں پھر اے دوست مرا فکرِ جمیل

اپنی دُنیائے طرب ناک میں لوٹ آئے گا

کہکشاں سے کبھی اُلجھے گا کبھی تاروں سے

کبھی افلاک کی ہر حد سے گزر جائے گا

یہ کرے گا کبھی مے خوار گھٹاؤں کا طواف

کبھی بدمست بہاروں میں سکوں پائے گا

کبھی مہتاب جمالوں میں ملے گا تجھ کو

اور کبھی زہرہ جبینوں میں نظر آئے گا

پھر گِلہ تجھ کو نہ ہو گا کہ مرا فکرِ جمیل

بھاگ نکلا ہے تخیّل کے سمن زاروں سے

مَیں نے ڈھونڈی ہے زمانے کے اندھیروں میں پناہ

دُور گردوں کے دَمکتے ہوئے سیّاروں سے

مرے افکار نے اب توڑ لیا ہے رشتہ

ابر کے کیف سے مہتاب کے نظّاروں سے

کوئی دل، کوئی نظر آج تو مجروح نہیں
مرے نغموں کی لچکتی ہوئی تلواروں سے

رُباعی

حیرت ہے غمِ جہاں تجھے راس نہیں
شاعر ہے پر اتنا بھی تجھے پاس نہیں
بلبل کی فغاں پہ رو رہا ہے لیکن
آدم کی فغاں کا تجھ کو احساس نہیں

غزل

چمن لُٹا گم ہوئے عنادل، اُجڑ گیا میرا آشیانہ
یہ ہے مری مختصر حقیقت، یہ ہے مرا مختصر فسانہ

نظر کی حد تک لگا دیا ہے سیاہ راتوں نے شامیانہ
اسی اندھیرے میں دیکھتا ہوں اُبھر رہا ہے نیا زمانہ

غضب تو یہ ہے کہ ہمصفیر اس کو بھی شکایت سمجھ رہے ہیں
اُبھر رہا ہے جو دل کی گہرائیوں سے اک غم بھرا ترانہ

نہ میں ہوں دیروز کا غزلخواں نہ میں ہوں فردا کا نغمہ آرا
یہی جو امروز ہے یہی ہے مرے تخیّل کا آستانہ
تمہیں تو صیّاد ہو کہ اپنوں کا رُوپ بھر کر چمن میں آئے
کرو نہ اب میری اشک شوئی اُجاڑ کر میرا آشیانہ
سیاہ خانوں میں رہنے والو! نظر اُٹھاؤ اُفق پہ دیکھو
وہ اک کرن توتلی زباں سے سُنا رہی ہے نیا فسانہ
فضا میں چمکی نئی تجلّی، زمیں پہ گُونجے نئے ترانے
ہر ایک ذرّہ پکار اُٹھا وہ آ رہا ہے نیا زمانہ
سمندروں کا خروش پھیلی ہوئی تجلّی کا جوش دیکھو
اِدھر ہیں امواج بے نہایت ، اُدھر ہیں انوار بے کرانہ
ہر ایک قطرہ یہ کہہ رہا ہے کہ مجھ میں پنہاں ہے رُوحِ دریا
ہر اک شرر یہ پکارتا ہے کہ درحقیقت میں ہوں زبانہ

نئے زمانے میں شعر گوئی سوالِ زیر و زبر نہیں ہے
کہ اس کے پیکر میں آج مضطر ہے وقت کی روح باغیانہ

نہیں کوئی شعر کا جو مقصد تو شعر گوئی ہے ژاژ خائی
بتا رہا ہوں سخن کے بارے میں تجھ کو اک رمزِ محرمانہ

جو کاکلِ صرف و نحو میں ہیں اسیر آزاد اُن سے کہہ دو
کہ سرحدِ صرف و نحو سے ہے کہیں پرے سرحدِ زمانہ

1

اے امیرِ کارواں

۱

اے امیرِ کارواں

اضطرابِ اہلِ کارواں بھی دیکھ

دیکھ کر خلوصِ اہلِ کارواں

ہو نہ اپنے دل ہی دل میں شادماں

پیچ و تابِ اہلِ کارواں بھی دیکھ

اے امیرِ کارواں

GOVT GIRLS COLLEGE
11605
LIBRARY

1

(۲)

اے امیرِ کارواں

کارواں کے پاؤں میں تھکن سی ہے

کارواں کی آنکھ میں چمک نہیں

کارواں کے عزم میں دمک نہیں

کارواں کی رُوح میں جلن سی ہے

اے امیرِ کارواں

(۳)

اے امیرِ کارواں

راستے میں کارواں نہ بیٹھ جائے

جا چکا ہے قافلے کا وہ شباب

چُپ ہیں آج نعرہ ہائے انقلاب

11803

اُٹھ رہا ہے ایک شورِ ہائے ہائے

اے امیرِ کارواں

(۴)

اے امیرِ کارواں

زندگی کا اک نشاں سا رہ گیا

سرد ہو گئی ہے ولولوں کی آگ
بُجھ چکی ہے تُند حوصلوں کی آگ

آگ بُجھ چکی دُھواں سا رہ گیا

اے امیرِ کارواں

(۵)

اے امیرِ کارواں

اپنے گرد و پیش کا مآل دیکھ

داستاں ہے اک نئی شروع دیکھ
صبحِ نَو کا چرخ پر طلوع دیکھ
بے بسوں کی رات کا زوال دیکھ
اے امیرِ کارواں

(۶)

اے امیرِ کارواں
رنگ کی لہو کی ندّیاں بھی دیکھ
اک نئی ضیا ہوئی ہے جلوہ گر
مغربی اُفق پہ تابہ کے نظر
اک نگاہ سوئے خاوراں بھی دیکھ
اے امیرِ کارواں
اضطرابِ اہلِ کارواں بھی دیکھ

رُباعی

دلدل ہی میں ناؤ کھے رہا ہوں آزاد
یوں دادِ حیات دے رہا ہوں آزاد
جس دشت میں بس بھری ہوا چلتی ہے
اُس دشت میں سانس لے رہا ہوں آزاد

غزل

محبّت میں اُنہیں اہلِ نظر کامل سمجھتے ہیں
جو اس طُوفان کی ہر مَوج کو ساحل سمجھتے ہیں

کبھی وُہ دن تھے اپنے دل کو ہم اپنا نہ کہتے تھے
مگر اب ہر بشر کے دل کو اپنا دل سمجھتے ہیں

سُنو اے جادۂ منزل کو منزل جاننے والو
کہ منزل کو بھی ہم تو جادۂ منزل سمجھتے ہیں

وُہ فن جو تاب لا سکتا نہ ہو دردِ زمانہ کی
ہم ایسے فن کو اِک افسانۂ باطل سمجھتے ہیں

وہی انسان ساحل پر جنہیں طوفاں کا دھوکا ہو
اگر اَڑ جائیں طوفانوں کو بھی ساحل سمجھتے ہیں

ہمیں نے اے محبّت قدر پہچانی ہے کچھ تیری
تجھے طوفاں، تجھے کشتی، تجھے ساحل سمجھتے ہیں

خفا ہونا نہ اے اہلِ زباں! میرے تکلّم پر
یہ وُہ طرزِ سخن ہے جس کو اہلِ دل سمجھتے ہیں

ہمارا ارتقا، آزاد! فنِ شعر میں یہ ہے
بہت آساں سمجھتے تھے بہت مُشکل سمجھتے ہیں

زندگی

(۱)

ہر طرف سے گھٹا گھر کے آتی رہی
چار جانب اندھیرے گراتی رہی
تیرگی ایک عالم پہ چھاتی رہی
لیکن ایسے میں بھی
زندگی رس بھرے گیت گاتی رہی
ہر طرف اپنے نغمے لُٹاتی رہی

(۲)

بربریت کی رَو تیز ہوتی رہی
یاس ہنستی رہی آس روتی رہی
خُوں سے انسانیت چہرہ دھوتی رہی
ایسے ماحول سے
اپنا دامن ہمیشہ بچاتی رہی
زندگی ہر طرف جگمگاتی رہی

(۳)

چرخ پر بادلوں میں خراماں رہی
بادِ صحرا کے جھونکوں میں رقصاں رہی
قمریوں کے گلُو میں غزل خواں رہی
حادثے دیکھ کر

قہقہے حادثوں پر لگاتی رہی

زندگی رس بھرے گیت گاتی رہی

(۴)

گاہِ طوفان بن کر اُبھرتی رہی

گاہ دریا کے دل میں اُترتی رہی

وقت کے ساز پر رقص کرتی رہی

شورشوں سے الگ

گُنگناتی رہی، مُسکراتی رہی

زندگی اپنا پرچم اُڑاتی رہی

(۵)

کہکشاں میں چمکتی دمکتی رہی

نرم رَو ندّیوں میں سرکتی رہی

پھول کی پتیوں میں لہکتی رہی
گویا تھی ہی نہیں
تلخیٔ دہر کو یوں بھلاتی رہی
شورشوں کو نظر سے گراتی رہی

(۶)

زندگی بے نیازِ زمان و مکاں
زندگی بے نیازِ غمِ این و آں
زندگی بے نیازِ بہار و خزاں
تُند ماحول میں
گُنگناتی رہی، مُسکراتی رہی
اور ظلمات میں جگمگاتی رہی

اشعار

غمِ جاناں سے بھی آگے، غمِ دوراں سے بھی آگے
اک ایسا غم بھی ہے الفاظ میں جو آ نہیں سکتا
نہیں ممکن کہ میں اس کو لباسِ نطق پہناؤں
سمجھ سکتا ہوں میں اس کو مگر سمجھا نہیں سکتا

جب اپنے آپ کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہوں
گماں ہوتا ہے یہ اب مَیں سفینہ پا نہیں سکتا

غزل

زندگی ہے تمام سوز و گداز
اے غمِ دوست! تیری عمر دراز

دردمندی کا دور ختم ہوا
مٹ چلیں دہر سے رسومِ نیاز

عشق اور عشق کی حقیقت کو
خاک سمجھے یہ عقلِ شعبدہ باز

اے نشیمن! مجھے فریب نہ دے
جا چکی اب تو حسرتِ پرواز

ہائے کیا شے ہے مصرعِ غالب
"مَیں ہوں اپنی شکست کی آواز"

وحشت میں آ کے اب یہ عالم ہے
اپنا گھر ہے مقامِ دُور و دراز

جشنِ آزادی

ایک دعوت نامے کے جواب میں

مجھے کیا پھر نویدِ جشنِ آزادی سناتے ہو
ابھی تک مَیں وہ پہلا جشنِ آزادی نہیں بھولا

چمن اہلِ چمن کے ہاتھ میں تم دیکھ کر خوش ہو
مگر مَیں اختتامِ دورِ صیّادی نہیں بھولا

نہیں بھولا ابھی تک مَیں چمن زاروں پہ کیا گزری

چمن زاروں میں جب اے دوست ہنگامِ بہار آیا

گرا پتّھر کی صورت خاک پر ہر قطرۂ باراں

ہر اک جھونکا صبا کا مثلِ تیغِ آبدار آیا

نشیمن جل اُٹھے شاخیں گریں اشجار سے کٹ کر

چمن اندر چمن اک آتشیں رَو چل گئی گویا

خلوص و صدق پر تھی بزمِ اربابِ چمن قائم

وُہ بنیادیں ہلیں یکسر وہ محفل جل گئی گویا

اِدھر صیّاد پھرتے تھے اُدھر صیّاد پھرتے تھے

کچھ اس انداز سے میرے گلستاں میں بہار آئی

اِدھر بھی آگ بھڑکی تھی اُدھر بھی آگ بھڑکی تھی
زمینِ باغ پر یُوں رحمتِ پروردگار آئی

ہُوا جب دُور برسوں کا اندھیرا اپنی دُنیا سے
اُفق پر ہم نشیں جس صُبح کو تازہ کرن پھُوٹی
نہ جانے وُہ کوئی مسعود یا منحوس ساعت تھی
کہ تدبیرِ وطن جاگی تو تقدیرِ وطن پھُوٹی

نظامِ زندگانی میں کچھ ایسا انقلاب آیا
مکانوں کے مکیں بدلے مکینوں کے مکاں بدلے
چمن والے چمن میں آبرو سے کس طرح رہتے
چمن بدلا، چمن کا رنگ بدلا، باغباں بدلے

ہُوا یُوں دم زدن میں آدمی کا آدمی بَیری
مروّت ہوگئی آنکھوں سے رخصت دُور سینوں سے
تسلّط غیریت نے یوں جمایا بزمِ اُلفت پر
محبّت کی جگہ نفرت برستی تھی جبینوں سے

اِسی ہندوستاں میں دھرم کی، مذہب کی دُنیا میں
تمدّن کو جنوں کی لہر میں بہتا ہُوا دیکھا
معین الدّین چشتی کی زمیں پر، کرشن کے گھر میں
مسرّت کو الم کی داستاں کہتا ہُوا دیکھا

اُسی پنجاب میں، جس کی محبّت کیش دُنیا میں
گورونانک نے اپنے دِل نشیں نغمات برسائے

کئے بڑھ بڑھ کے افعالِ زبوں وُہ ابنِ آدم نے
درندوں کو تو کیا ابلیس کو بھی جن پہ شرم آئے

وہی بنگال گونج اُٹھا جنوں انگیز نعروں سے
ترانے پیار کے قاضیؔ جہاں گاتا رہا برسوں
اُسی کی سرزمیں پر خونِ انساں کی ہُوئی بارش
جہاں جامِ وفا ٹیگورؔ چھلکاتا رہا برسوں

بھڑکتی آگ دیکھی ہر جگہ، کٹتے بشر دیکھے
غضب تھا اشرف المخلوق کا جذبِ بہیمانہ
لہو کی ندّیوں میں ہر طرف بہتی ہُوئی دیکھی
حقیقت وُہ کہ جس سے مات کھا جائے ہر افسانہ

ہ قاضی نذر الاسلام

اشارہ غیر کا تھا، ہمت اپنی تھی ہوس اپنی

دکھائے واہ کیا تیور، وطن کے خوش خصالوں نے

جہالت کی سیاہی چہرۂ تہذیب پر مل دی

نئی تاریخ یوں لکھی وطن میں لکھنے والوں نے

ابھی تک دوست! یہ سارے مناظر یاد ہیں مجھ کو

ابھی تک دیدۂ حیراں میں پھرتی ہیں یہ تصویریں

ابھی تک یاد ہیں وہ جشنِ آزادی کے نظارے

وہ منظر یاد ہے ٹوٹی تھیں جب برسوں کی زنجیریں

مجھے کیا پھر نویدِ جشنِ آزادی سناتے ہو

ابھی تک میں وہ پہلا جشنِ آزادی نہیں بھولا

چمن اہلِ چمن کے ہاتھ میں تم دیکھ کر خوش ہو
مگر مَیں اختتامِ دورِ صیّادی نہیں بھولا

رُباعی

اپنے دِل کو فریب دینے والو!
کیچڑ کی ندی میں ناؤ کھینے والو!
جینے کی یہ آرزو دِلوں میں کب تک
بُو دار فضا میں سانس لینے والو!

غزل

بت پر کیا احساں کبھی تُو نے کبھی مَیں نے
جفا کی داد دی تُو نے، وفا کی داد دی مَیں نے

سالِ آرزو تُو نے بھی جانِ آرزو دیکھا
تری ہر آرزو آخر تجھی کو سونپ دی مَیں نے

رم والو! پُرانے دوستو! ایمان سے کہنا
بسر کی ہے تمہارے ساتھ کیسے زندگی مَیں نے

ہزاروں بار آیا ہے جنوں امداد کو لیکن
ہزاروں بار کھایا ہے فریبِ آگہی مَیں نے

خوشی پر مٹنے والو! پوچھنا مجھ سے کہ دیکھا ہے
کمالِ سرخوشی ہی میں مآلِ سرخوشی مَیں نے

بہارِ رنگ و بُو نے ہر قدم پر دام پھیلایا
نہیں ہونے دیا دل کو اسیرِ دلکشی مَیں نے

منوّر کر لیا ہے داغِ دل سے راہِ منزل کو
کبھی مانگی نہیں شمس و قمر سے روشنی مَیں نے

یہی آنکھیں کہ ہیں دورِ خزاں کی اب تماشائی
انہی آنکھوں سے دیکھی تھی بہارِ زندگی مَیں نے

فریبِ رنگ و بُو کو بارہا نظروں نے ٹھکرایا
یہ مانا بارہا تیری کمی محسوس کی مَیں نے

سیرِ پاکستان

(۱)

طیّارے سے خطاب

گزرے ہوئے دور کو بُلانے والے
بچھڑی ہوئی دُنیا سے مِلانے والے
اللہ تجھے اور سُبک بال کرے
اے مجھ کو وطن میں لے کے جانے والے

آ ہوئے رمیدہ کو ختن میں لے جا
بچھڑے ہوئے بلبل کو چمن میں لے جا
آزاد کے منتظر ہیں یارانِ وطن
آزاد کو یارانِ وطن میں لے جا

(۲)

مغربی پنجاب میں

چھوڑی ہوئی انجمن میں واپس آیا
مہجورِ وطن وطن میں واپس آیا
اے اہلِ چمن! چمن میں اعلان کرو
شیدائے چمن، چمن میں واپس آیا

پھر اہلِ سخن بزمِ سخن میں آیا
آزاد پھر اپنی انجمن میں آیا
آتی ہے صدا چمن کے ہر ذرّے سے
پھر بلبلِ گم گشتہ چمن میں آیا

پھر دُرِ عدن، عدن میں واپس آیا
آہوئے ختن، ختن میں واپس آیا
اے اہلِ یمن! نظر اُٹھاؤ، دیکھو
پھر لعلِ یمن، یمن میں واپس آیا

(۳)

واپس آتے ہوئے

گزرے ہُوئے دِن یاد دلانے والو!
ہُشیار کو دیوانہ بنانے والو!
آزاد کو گفتگو کا یارا ہی نہیں
آزاد کو آنکھوں پہ بٹھانے والو!

مانا کہ اُسے درد سے آزاد کیا
تسلیم کہ ناشاد کو دل شاد کیا
آزاد کو رکھّا نہ کہیں کا تم نے
یوُں لُطف و کرم سے اُس کو برباد کیا

دل میں نہ غمِ تازہ لبسا لاتا ئیں
اے کاش نہ یوں جلد پلٹ آتا ئیں
اشجارِ وطن کی چھاؤں میں دم لینے
اے کاش ذرا اور ٹھہر جاتا ئیں

غزل

اُلجھ کے رہ گئے پہلے قدم پہ فرزانے
گذر گئے حدِ دیر و حرم سے دیوانے

وہاں پہنچ کے بھی مَیں نے تجھے صدا دی ہے
جہاں پہنچ کے مجھے تو کبھی نہ پہچانے

جنوں سے پُوچھ یہ رازِ نہاں خرد سے نہ پُوچھ
جمالِ شمع پہ کیوں ٹوٹتے ہیں پروانے

دیارِ غیر میں اپنوں کی جستجو کیسی؟
عزیز و خویش و اقارب تمام بیگانے

یہ باغباں سے کہو بزمِ گل کی خیر منائے
چمن کی سمت بیاباں سے آئے دیوانے

خزاں کے پھول مری بے بسی کے عنواں ہیں
بہار و باغ تری سروری کے افسانے

اگرچہ شوق تھا مائل نشاط اُڑانے پر
خزاں میں گا نہ سکا میں بہار کے گانے

جب حجابات اُٹھے

دفعتہً نغمۂ شادی سے فضا گُونج اُٹھی
ہر طرف حُسن و محبّت کے حجابات گرے
غم کی دُنیا پہ مسرّت کے حجابات گرے

نالۂ درد ترانوں میں سُنائی نہ دیا
اور ہم سمجھے کہ نالوں کا سمے بیت گیا
مکر و فن ہار گئے ذوقِ وفا جیت گیا

دفعتہً ایک تجلّی سی فضا میں پھیلی
ہم یہی سمجھے کہ تاریکیٔ شب دُور ہوئی
اپنی دُنیائے کہن آج سے پُر نُور ہوئی

اِتنی شدّت سے ہُوا شورِ مساوات بلند
ہم نے یہ جانا کہ انسان سبھی ایک ہُوئے
"بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہُوئے"

اختلافات کی زنجیرِ کہن ٹوٹ گئی

کوئی سرمایہ و محنت میں تفاوت نہ رہا

حُسن کی صورت و سیرت میں تفاوت نہ رہا

اپنی محفل سے جب اغیار نے محمل باندھا

ہم نے یہ سمجھا کہ اغیار کا اب دَور گیا

آشتی آئی ہے پیکار کا اب دَور گیا

جب مگر وقت کے جھونکوں نے حجابات اُٹھائے

وہ تماشا نظر آیا کہ بیاں ہو نہ سکے

عِشق مائل ہو فغاں پر تو فغاں ہو نہ سکے

انجمن میں وہی فرسودہ نظارے دیکھے
انجمن میں وہی نالے بھی تھے فریادیں بھی
کہنہ یادوں کا تعفّن بھی، نئی یادیں بھی

ہر طرف ایک تظلّم سے تھا کہرام بپا
اضطرابات کی اک گونج تھی بے طور بلند
بھوک کا شور تھا پہلے سے بھی کچھ اور بلند

یہ مساوات کا نقشہ بھی عجب نقشہ تھا
آدم آدم سے ہراساں نظر آتا تھا ابھی
دشمن انساں کا انساں نظر آتا تھا ابھی

یہ مساوات جو دیکھی تو نظر گھوم گئی
بُھوک کے ہاتھ میں جنتا کو سِسکتے دیکھا
ماؤں کی گود میں بچّوں کو بِلکتے دیکھا

سو گیا رات کو سردی میں سڑک پر جو غریب
صبح سے قبل سڑک ہی پہ وہ دم توڑ گیا
اور "انسان" اُسے دیکھ کے مُنہ موڑ گیا

اس پہ بھی اس سے گلہ تھا کہ وفادار نہیں
اس پہ بھی "ساتھ رہو ساتھ" کہے جاتے تھے
اور نادان سبھی کچھ یہ سہے جاتے تھے

درد ہی درد تھا درماں نظر آتا ہی نہ تھا
اور اس درد کے شکوے کی سماعت ہی نہ تھی
بلکہ اس بزم میں شکوے کی اجازت ہی نہ تھی

یہ غلط ہے کہ تھا سرمایہ و محنت میں ملاپ
بلکہ سرمائے کا چلتا تھا وُہی کہنہ فسوں
اور پہلے سے بھی محنت کا تھا انجام زبوں

ایک لحظے ہی میں نعروں کا بھرم ٹوٹ گیا
یہ مساوات کے نعرے تھے فقط جھُوٹ ہی جھوٹ
نظر آتی تھی ہر اک سمت بس اک لُوٹ ہی لُوٹ

اب تو اس بزم میں نغمے کا تصوّر ہی نہ تھا
شور و شیون تھے اب اس بزم میں بے طور بلند
درد کہتا تھا کہ ہاں اور بلند، اور بلند

دَور آیا تھا مساوات کا، آزادی کا
مگر اس دَور میں گفتار پہ پابندی تھی
بند تحریر تھی، فن کار پہ پابندی تھی

گرچہ ہر بات میں انسان تھا آزاد مگر
نہ تڑپنے کی اجازت تھی نہ فریاد کی تھی
کچھ نرالی ہی تمنّا دلِ صیّاد کی تھی

ایک دوست کے نام

جو شاعر بھی ہے اور ہم خیال بھی

اُٹھ کہ پیدا ہے تجلّی اُفقِ خاور پر
اس تجلّی کو زمانے میں سحر بار کریں
چھا گیا ابرِ مساوات فلک پر ہر سُو
خاک پر اس کو گہر ریز و گہر بار کریں

صبح کا نور لئے دولتِ بیدار آیا

عام اب دہر میں یہ دولتِ بیدار کریں

عزم کے ہاتھ میں شمشیرِ شجاعت دے کر

جہدِ ہستی میں اسے مائلِ پیکار کریں

مائلِ خواب نہ ہو جاگ اُٹھے بزمِ جہاں

اپنے نغمات سے پیدا نئی جھنکار کریں

رُوحِ انساں تو ہے بیدار بڑی مدّت سے

ذہنِ انساں کو اب اس دَور میں بیدار کریں

دامِ انوار کا پستی و بلندی پہ بچھائیں

اس میں دُنیا کے اندھیروں کو گرفتار کریں

دہر پر عدل و مساوات کا پرچم لہرائیں

پرچمِ ظلم کو عالم میں نگوں سار کریں

سطحِ کاشانۂ انساں میں ہے ناہمواری
وقت کا حکم ہے اس سطح کو ہموار کریں

آدم آدم کا نئے دور میں غمخوار نہیں
آ کہ انسان کو انسان کا غمخوار کریں

کس لئے تیغ شقاوت کی رواں ہو ہر سُو
آ کہ اس تیغ کو اب کُند و کم آزار کریں

اپنی بیداری سے اب کام نہیں چل سکتا
خود تو بیدار رہیں اوروں کو بھی بیدار کریں

دہر کو مِل نہ سکا "اندک و بسیار" کا حل
آ کہ حل مسئلۂ اندک و بسیار کریں

رُوئے عالم پہ جو پامال نظر آتا ہے
رُوئے عالم کا اُسے مالک و مختار کریں

جس پہ ہر نعمتِ عالم کے ہیں دروازے بند
اُس کو ہر نعمتِ عالم کا سزاوار کریں

مژدہ اے دوست! کہ پیغمبرِ انوار آیا
آ کہ نظّارۂ پیغمبرِ انوار کریں

جو گرفتارِ غمِ فتنۂ جاناں ہیں اُنہیں
واقفِ غلغلۂ گرمئ بازار کریں

زلف و رخسار کے بیمار خریداروں کو
رسن و دار سی چیزوں کا خریدار کریں

حکم پابندئ صیّاد کا جاری کر کے
جشنِ آزادئ مرغانِ گرفتار کریں

دوست ظاہر میں چمن کے جو ہوں باطن میں عدو

زندگی اُن کی چمن زار میں دشوار کریں
اپنا پیغام زمانے کو سُنانے کے عوض
تاج اور تخت بھی ملتے ہوں تو انکار کریں

غزل

چمن میں یہ زباں بندی کے احکام
کہاں جائیں، کسے آواز دیں ہم
دلِ ناداں یہاں خاموش رہنا
نہ ہو جائے مزاجِ دوست برہم
خموشی سازِ دل پر ہے غزل خواں
خدا جانے یہ نغمہ ہے کہ ماتم

اسی سے ایک دن پھوٹیں گے شعلے
یہی لَے آج جو اِتنی ہے مدّھم

رُباعی

دُنیا کے ہر اک غم کو سنبھالا ہم نے
ہر سانپ کو آستیں میں پالا ہم نے
اس بزمِ جہاں میں اے شرافت تیرا
اس طرح کیا ہے بول بالا ہم نے

ڈل کے کنارے ایک صُبح

ذرا تو رحم کرو صبح کی لطیف ہواؤ
جو بجھ چکی ہیں وہ چنگاریاں نہ پھر سلگاؤ
تھپک تھپک کے سلایا ہے جن کو دِقّت سے
اُن آرزوؤں کو پھر میری روح میں نہ جگاؤ
مجھے یہ ڈر ہے کہ پھر سے کہیں سلگ نہ اُٹھیں
بجھے بجھے سے یہ ویرانۂ جنوں کے الاؤ

بُجھا چکا ہوں جسے اک طویل مدّت سے
وہ شمع پھر مری محرابِ شوق میں نہ جلاؤ
مٹے نہیں ہیں ابھی ذہن پر بنے تھے جو نقش
بھرے نہیں ہیں ابھی روح پر لگے تھے جو گھاؤ
ذرا بھی شوق نہیں دل میں ذکرِ ماضی کا
مجھے زمانۂ ماضی کی داستاں نہ سُناؤ
مجھے ہے ڈر کہ تمہارا یہ زمزمے کا خروش
یہ زیر و بم کا سلیقہ یہ نغمگی کا بہاؤ
مرے سکون کی دُنیا کو لے چلے نہ وہاں
جہاں بہت ہی کٹھن ہو رہا ہوں کا رکاؤ
سرور و کیفِ چمن میں بسے ہوئے جھونکو
بہت ہی دُور رہو تم مرے قریب نہ آؤ

فسردہ ہو بھی چکا اب تو آرزو کا نکھار
شکستہ ہو بھی چکے اب تو زندگی کے بناؤ
یہ برگ و گل پہ نہ چھیڑو ترانہ ہائے جمیل
یہ شاخہائے شجر میں اُلجھ اُلجھ کے نہ گاؤ

نہ جانے دل میں ہیں خوابیدہ کتنے ہنگامے
(یہ خواب کچھ بھی سہی) ان کو خواب سے نہ جگاؤ

رُباعیات

نکلے جو چمن سے نغمہ سنجانِ چمن
دیکھی نہ گئی حالتِ ویرانِ چمن
پھولوں کا کہیں نشاں نہ تھا گلشن میں
معمور تھا خار و خس سے دامانِ چمن

تُو کس کو سُنا رہا ہے نغمے، گانے
اے شاعرِ خود فریب، اے دیوانے!
سرمایہ، ادب کو مول لے سکتا ہے
سرمایہ مقامِ شعر کیوں پہچانے

غزل

ساحل ہے طوفاں، طوفاں ہے ساحل
ہُشیار اے دِل! ہشیار اے دِل!

تیرا کرم ہے بادِ بہاراں
ہر شاخ زخمی، ہر پھول بسمل

اے اہلِ زنداں! آنکھیں تو کھولو
ٹوٹے پڑے ہیں بند و سلاسل

ہمّت نہ ہارو اے جاں سپارو!
وُہ آئی منزل، وُہ آئی منزل

پھُولوں کی خوشبو، ظاہر میں احباب
باطن میں لیکن شمشیرِ قاتل

سچّی طلب تھی مفقود ورنہ
قدموں تک آتی خود کھِنچ کے منزل

سینے میں تو نے غم کو بسایا
آزادؔ لیکن کیا غم کا حاصل؟

غزل

یہی مجھ سے ہو سکا ہے کہ ہے آرزو فراواں
یہ مری خطا نہیں ہے جو نظر ہے تنگ داماں

یہ جو دِل کی کیفیت ہے، نہیں راز اگر تو کیا ہے
کبھی گلستاں میں چُپ ہوں کبھی دشت میں غزلخواں

کبھی تیری جُستجو ہے، کبھی اپنی جُستجو ہے
کبھی زِندگی پریشاں، کبھی شاعری پریشاں

تجھے کیا بتاؤں اے دل جسے کہہ رہا ہوں مشکل
وہ جو مُلتفت اِدھر ہوں وُہی زندگی ہو آساں

کوئی ایک ان میں چُن لے کہ جہانِ زندگی میں
غمِ دوست بھی بہت ہے غمِ دہر بھی فراواں

یہ بتا رہے ہیں مُجھ کو مری ہر غزل کے تیور
کہ تری ہی آرزو ہے مری فکر میں خراماں

مرے درد کی لطافت ہے تری نظر کا پرتَو
مرے پردۂ سخن میں ترا نطق ہے غزلخواں

مری ہر نوائے غم میں ترے سوز کی جھلک ہے
یہ جو تُو نہیں تو کیا ہے مرے شعر میں درخشاں

یہ نگاہ کے ہیں تیور، یہ خیال کے ہیں پہلو
یہی زندگی چمن ہے، یہی زندگی بیاباں

منزل ہے کہاں تیری؟

ہر ایک چیز زمانے میں آنی جانی ہے
ہر ایک عزم حقیقت نما کہانی ہے
بس اِتنی بات ہی دنیا میں جاودانی ہے
کہ اضطراب ابدی اور غیر فانی ہے
ازل سے گرمِ تمنّا ہے ولولہ دل کا
کہیں رُکا نہ زمانے میں قافلہ دل کا

یہ دلِ زمانۂ شاہی میں مطمئن نہ رہا
زمیں کا دَور جب آیا اسے سکوں نہ ملا
زمیں کے دَور کے بعد آیا دَورِ سرمایہ
یہاں بھی ذوقِ نظر مائلِ قرار نہ تھا
گیا یہ دَور تو دین و وطن کے دَور آئے
فرات و دجلہ کے گنگ و جمن کے دَور آئے
ہر ایک وقت کا دل نے کیا قبول اثر
ثبات مل نہ سکا ایک دَور کو بھی مگر
اب اشتراک پہ ٹھہرا تو ہے مذاقِ نظر
مگر یہ کون کہے یہ بھی شاخ ہے کہ ثمر
کسے خبر یہ کوئی موج ہے کہ ساحل ہے
چراغِ راہگذر ہے کہ منزلِ دل ہے

غزل

گلستاں میں چلی بادِ بہاراں
ہوئی پھر زندہ بزمِ شاخساراں

بہ اُمیدِ نگاہِ چارہ کاراں
وُہ آپہنچا ہجومِ دل فگاراں

قرارِ خاطرِ آشفتہ حالاں
شمیمِ دل کشائے مرغزاراں

ذرا دیکھ اے جلالِ شہریاری
جمالِ گلستاں، حُسنِ بہاراں

وہ ہر تختے پہ اک جشنِ مسرّت
وہ ہر گوشے میں اک بزمِ نگاراں

پیامِ دوست بن کر آرہی ہے
نوائے دلربائے آبشاراں

قطعہ

مَیں اُس دل کو کہاں لے جاؤں آخر
نہ خوش آئے جسے فصلِ بہاراں
کبھی آسودہ اپنے درد و غم میں
کبھی نالاں مثالِ جوئبا راں

یہ راز آخر زباں پر آگیا ہے
مدد اے غمگساراں ! رازداراں!

عزائم

دامنِ گیتی پہ نقش اپنا بٹھاتے جائیں گے
اس طرح اپنا قدم آگے بڑھاتے جائیں گے

سُست گامی کا گِلہ کیا وادیٔ پُرخار میں
جب چلیں گے ہم نئے رستے بناتے جائیں گے

محفلِ احباب کے اس بے سُرے ماحول میں
ہم نئے نغمے نئے سازوں پہ گاتے جائیں گے

رنگ و بو کی انجمن میں شور کیوں برپا کریں
مسکراتے جائیں گے ہم گنگناتے جائیں گے
کہنہ لے سے روح کو تسکین مِل سکتی نہیں
اپنی دُھن میں اپنی ہی تانیں اُڑاتے جائیں گے

اِس جہاں اور اُس جہاں کی تلخیوں کے روبرو
رقص کرتے جائیں گے ہم مسکراتے جائیں گے
راہ میں گر حادثے آتے ہیں آنے دو انہیں
حادثوں پر قہقہے پیہم لگاتے جائیں گے
نام لیوا درد کا کوئی یہاں ہو یا نہ ہو
دوستو! ہم درد کی دولت لٹاتے جائیں گے
ہاں ہمارے فیصلوں میں فیصلہ اک یہ بھی ہے

دوست بنتے جائیں گے دشمن بناتے جائیں گے

روکنے کے شوق میں کوئی جو آئے گا تو ہم

بے نیازانہ قدم آگے بڑھاتے جائیں گے

ہم کوئی فتنہ کہیں بیدار دیکھیں گے اگر

اپنے سحر انگیز نغموں سے سلاتے جائیں گے

اپنے اشکِ گرم و آہِ سرد کی تاثیر سے

خرمنِ ہستی کی آتش کو بجھاتے جائیں گے

اس جہاں کو بخش کر اے دوست! جنّت کا جمال

قہقہے جنّت کی دنیا پر لگاتے جائیں گے

اور اگر آئے نظر بے رنگ تصویرِ جہاں

خونِ دل کے رنگ سے رنگیں بناتے جائیں گے

چشمِ عالم میں تجلّی کی کمی دیکھیں گے جب

نور بن کر چشمِ عالم میں سماتے جائیں گے

مختصر یہ ہے کہ اے آزاد اپنے آس پاس
عزم سے اپنے نئی دُنیا بساتے جائیں گے

غزل

تری نوا سے شکایت ہے مجھ کو مُرغِ چمن
کہ تار تار ہُوا ہے خرد کا پیراہن

قفس نصیب پرندوں کو سازگار نہیں
ہوائے دشت و بیاباں، فضائے صحنِ چمن

مآلِ کشتیٔ قلب و نظر خدا جانے
یہ موجِ نکہتِ گُل، یہ خرامِ رنگِ چمن

نصیب سبزۂ خوابیدہ کا نہ جاگ سکا

چمک چمک کے فسردہ بھی ہو گئی ہے کرن

خرامِ گردشِ دوراں ذرا تو مہلت دے

ذرا میں دیکھ تو لوں جلوہ زارِ کوہ و دمن

ترے ہی ساتھ مجھے بھی سفر پہ جانا ہے

ٹھہر تو قافلۂ نوبہارِ سرو و سمن

خزاں کے تند بگولو ذرا ٹھہر جانا

چمن کے ساتھ نہ لٹ جائے آبروئے چمن

طلسمِ رنگِ چمن ہے بہار کیا شے ہے

خزاں؟ خزاں ہے شکستِ طلسمِ رنگِ چمن

قطعہ

کوئی نہ ہمدمِ نو ہے نہ ہے رفیقِ کہن

اسی سے پیار کروں مَیں یہی ہے میرا وطن

وطن سے دُوریٔ منزل کا یہ سوال نہیں

وُہ بے وطن ہوں کہ جس کا نہیں ہے کوئی وطن

کنارِ سندھ پہ ہم جس کو چھوڑ آئے ہیں

وہ تجھ میں بات کہاں اے دیارِ گنگ وجمن

ذرّو! قطرو!

ذرّو!

اپنے سوزِ دروں سے چمکو اور خورشید بنو

قطرو!

اپنے عزمِ جواں سے پھیلو اور طوفان بنو

ذرّو! قطرو!

ایک نئے مضمون کی اب تمہید بنو

ذرّو! قطرو!

ایک نئی محفل کا اب سامان بنو

ذرّہ ــــ مُردہ خاک نہیں ہے اس میں اب کچھ اور بھی ہے
علم نے اب یہ فاش کیا ہے
ذرّہ قوّت کا پیکر ہے
دُنیا نے اب جان لیا ہے
ذرّہ طاقت کا مظہر ہے
ایک جہاں میں شور بپا ہے
برق کا ذرّے میں عنصر ہے
ذرّہ ــــ مُردہ خاک نہیں ہے اس میں اب کچھ اور بھی ہے
محض فسردہ خاک نہیں ہے اس میں اب کچھ اور بھی ہے

قطرہ ——— ظاہر میں بے رنگ ہے باطن میں بے آب نہیں

قطرہ جب چاہے گردوں پر
بادل بن کر چھا سکتا ہے
ننّھا سا پانی کا یہ پیکر
طوفاں بن کر آ سکتا ہے
اولا بن جائے تو اکثر
بنیادوں کو ڈھا سکتا ہے

قطرہ ——— ظاہر میں بے رنگ ہے باطن میں بے آب نہیں
ہاں یہ فقط اک قطرہ ہے جینے کو اگر بے تاب نہیں

ناگاساکی پر جو گرا تھا وہ کیا تھا؟ اک ذرّہ تھا

آج جو طوفاں اک "خطرہ" ہے کل یہ فقط اک قطرہ تھا

بے سود و کمزور نہ جانو
اپنی ہستی کو پہچانو
ذرّو
اپنے سوزِ دروں سے چمکو اور خورشید بنو
قطرو
اپنے عزمِ جواں سے پھیلو اور طوفان بنو
ذرّو! قطرو!
ایک نئے مضمون کی اب تمہید بنو
ذرّو! قطرو!
ایک نئی محفل کا اب سامان بنو

اشعار کے گم ہو جانے پر

ظُلمات میں جس طرح شرارہ ڈوبے
یا جیسے خلا میں اک ستارہ ڈوبے
بحرِ نسیاں میں گم ہوئے یوں اشعار
طوفان میں جس طرح کنارہ ڈوبے

فردوس کے طائرو! کہاں ہو۔ لو لو

سوئے ہو اگر کہیں تو آنکھیں کھولو
مَیں کب سے لئے ہوئے ہوں دامِ تخئیل
کِس شاخ پہ بیٹھے ہو ذرا پَر تولو

منزل کے تجسّس میں بڑھے جاتا ہوں
ہوتا ہے گماں ابھی نشاں پاتا ہوں
ہمّت کی زبونی کا یہ عالم ہے مگر
منزل کے قریب جاکے لَوٹ آتا ہوں

ماحولِ گلستاں کے سہارو! آجاؤ
گذرے ہوئے شاداب نظارو! آجاؤ
چھوڑو نہ خزاں کے رحم پر تم اس کو

گلشن سے خفا نہ ہو بہارو! آجاؤ

پھر سوزِ درونِ دل سے نور لے کر چمکو
پھر تیرہ و تاریک فضا میں دمکو
ہاں اپنی تجلّی سے مٹا دو یکسر
کرنو! ظلمت کی یورشِ پیہم کو

غزل

خزاں کا ابھی تک چمن رہگذر ہے
چمن زاد نظروں کو اتنی خبر ہے

تجلّی تو گردوں پہ چمکی ہے لیکن
تجھے واقعی کیا یقینِ سحر ہے؟

تری محفلِ رنگ و بُو میں مجھے کب
مجالِ سخن ہے مجالِ نظر ہے

ہر اک گام پہ تھکنے والو الجھوں کیا
کہاں اب مری اِنتہائے سفر ہے
کہاں سنگِ منزل ہے اے رہنماؤ
ذرا کچھ تو بولو جو اس کی خبر ہے
شکایت جو آزاد کے لب سے نکلی
"مرے سامنے ایک مشکل سفر ہے"
کہا پھول نے "دیکھ میرا تبسّم
مری زندگی کس قدر مختصر ہے"

ایک رئیس کے نام

ایک دعوت سے اُٹھ کر چلے آنے پر

محفلِ رنداں میں یہ "ذرہ" ہے یہ "اختر" یہ کیا؟
میکدے میں امتیازِ کہتر و مہتر یہ کیا؟

اے درِ افرنگ کے ادنیٰ غلام ابنِ غلام
کیوں ابھی تھامے ہوئے ہے تو قدامت کی زمام

کم نظر یہ دورِ سرمائے کا مٹ جانے کو ہے
بزمِ نو میں پرچمِ جمہور لہرانے کو ہے

یہ بلندی اور پستی چار دن کا کھیل ہے
یہ "بڑے" "چھوٹے" کی ہستی چار دن کا کھیل ہے

اے سراپا جہل اے پروردۂ حرص و ہوا
تو ابھی کیا طبعِ شاعر سے نہیں ہے آشنا
تاج کی زنگت گزرتی ہے اگر دل پر گراں
نوک سے جوتے کی ٹھکراتے ہیں ہم تاجِ شہاں
اس کو آجاتی ہے اکثر بادِ صحرا سازگار
بارہا ہوتی ہے اس کو بوئے گُل بھی ناگوار
اس جہانِ آب و گل میں منزلِ شاعر ہے کیا
تجھ کو میں سمجھاؤں کیا ناداں دلِ شاعر ہے کیا
سخت تر پتھر سے لیکن برگِ گل سے نرم تر

شور و شر سے دُور رازِ شور و شر سے باخبر

تاک میں جس طرح مے ہو جس طرح مے میں سرور

سینۂ شاعر میں یوں رہتا ہے قلبِ ناصبور

تو نے لیکن اپنے ہی کانٹے پہ اس کو تول کر

دے دیا ہے شہد میں گویا مجھے بس گھول کر

تو ہے جاہل شعر کی تجھ کو خبر کوئی نہیں

تو ہے پتھر نطق کا تجھ پر اثر کوئی نہیں

"پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر"

اس جہالت پر تو کر سکتا ہوں میں تجھ کو معاف

دُکھ تو یہ ہے تیرے دِل کا آئینہ ہے غیر صاف

تیری نظروں پر بھی چھایا ہے ترے دل کا غبار
دیکھ لیتا ورنہ مستقبل کا حُسنِ آشکار
اب بھی ممکن ہو تو اے ناداں جہالت سے گزُر
اپنی آنکھیں کھول اور اس دَور کا نظارہ کر
راج جب دُنیا میں ہوگا ہر طرف جمہور کا
چار جانب پر فشاں ہوگا علم مزدور کا
دہر میں باقی نہ ہوں گے جب ہری سنگھ اور نظام
عدل کے ہاتھوں میں ہوگی اسپِ عالم کی زمام
ہو چکی ہوگی نشیبوں سے بلندی ہمکنار
خواب میں ہوگی شہنشاہی کہیں زیرِ مزار
سر میں ہے جو نشۂ نخوت ہوا ہو جائے گا
بے خبر تیرا یہ کرّ و فر فنا ہو جائے گا

ہو رہا ہے بطنِ گیتی سے نیا سورج طلوع

یہ نیا سورج کرے گا تازہ افسانہ شروع

یہ نیا سورج نئے ایام کی تمہید ہے

اس کی تابانی اندھیرے دَور کی تردید ہے

دیکھ اس سورج کی لَو سے آدمی گرما اُٹھا

خاک میں تپتے ہوئے تانبے کا جوبن آ گیا

بزمگہ سے رزمگہ کو بڑھ چلی ہے زندگی

خاک سے افلاک تک سینوں کی دھڑکن گُونج اُٹھی

کھول اُٹھا ہے خونِ انساں آج لاوے کی طرح

تپ رہا ہے آدمی کا ذہن آوے کی طرح

اس فضا میں ذرّہ ذرّہ کھا رہا ہے پیچ و تاب

انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب

اپنی آنکھیں کھول حرکت کو نہ تو فانی سمجھ
قیدیٔ ظلمت ذرا مفہومِ تابانی سمجھ

تاکہ دَورِ نو میں بھی تجھ کو نہ پچھتانا پڑے
دشمنِ انسانیت تجھ کو نہ کہلانا پڑے

اب وُہ دَورِ نو نہ ہو گا دَور سینتالیس کا
اب نہ دیکھے گا کوئی بھی طَور سینتالیس کا

خبث تھا انگریز کے دل کا وہ دَورِ کشت و خوں
ہو گیا کیوں کر مسلّط ورنہ ذہنوں پر جنوں

کھیل سا تھا ایک سینتالیس کا یہ انقلاب
اس سے تو اپنی ہوئی ہے اور بھی مٹّی خراب

اک تماشا تھا، تماشے کے سوا کچھ بھی نہ تھا

مسخرے تھے وہ جنہوں نے انقلاب اس کو کہا
ہر بشر پر یہ حقیقت اب تو ثابت ہو چکی
انقلابی دَور کی تو یہ نہ تھی تمہید بھی
یہ فسادی دَور اے غافل! جو ہوتا انقلاب
شیطنت کی طاقتیں کس طرح رہتیں کامیاب؟

بھُول اب اس کو حقیقی انقلاب آنے کو ہے
بزمِ عالم کے بڑھاپے پر شباب آنے کو ہے
اب نئی ترتیب دی جائے گی بزمِ دہر کو
اب بنایا جائے گا امرت جہاں کے زہر کو
اوّل اوّل آگ کا طوفاں اُٹھایا جائے گا
پھر اُسے گلزار آخر میں بنایا جائے گا

لانے والے گلستاں میں وہ بہاریں لائیں گے
پھُول کانٹوں کی نزاکت دیکھ کر شرمائیں گے

وقت اس دُنیا میں یہ پیغام لے کر آئے گا
وقت سے جو آج ٹکرّ کھائے گا مٹ جائے گا

کم نظر تو بھی نگاہیں کھول کر وُہ دُور دیکھ
زندگی نے کس طرح بدلے ہیں اپنے طور دیکھ

اور اگر دیکھا نہ تو نے وقت کی رفتار کو
وقت بھُولے گا نہ اک لحظ ترے کردار کو

تو اگر ملحق رہا سکّوں کی جھنکاروں کے ساتھ
وقت رکھے گا تجھے دُنیا کے غدّاروں کے ساتھ

غزل

ہمّت نہ ہارو! ہمّت نہ ہارو
میرے چمن کی زخمی بہارو

طوفاں کی موجیں للکارتی ہیں
قائم رہو گے کب تک کنارو

ذرّوں کے تیور بگڑے ہوئے ہیں
اے چاند تارو! اے چاند تارو!

کب تک رہو گے میرے وطن میں
بے کیف رنگو! خونیں نظارو!

واپس دلا دو ہم کو اسیری
آزادیوں کے پروردگارو!

اے آنے والے ادوارِ تاباں
میرے قلم پر سجدے گذارو

میرے رفیقو وقت آگیا ہے   بزمِ جہاں کا چہرہ نکھار دو

بکھرے ہوئے ہیں گیتی کے کاکل

آزاد! اُٹھو ان کو سنوار دو!

ایک شعر

اب جو تاراج گلستاں ہے بس اتنی ہے خطا

ہم نے اک روز بہاروں کی دعا مانگی تھی

غرورِ ادب

"بسکہ گردوں سفلہ و دوں پرور است
وائے بر مردے کہ صاحب جوہر است"

تمہیں خبر بھی ہے اے سفلگانِ سست نہاد
ادب میں کس قدر اونچا ہے رتبۂ آزاد
زمانہ ہے مرے نغموں پہ گوش بر آواز
دلوں کو چھیڑ گئی بارہا مری فریاد

مرے سخن کو سراہا ہے مہر و سالک نے

نیاز و جوش سے لی ہے مرے کلام نے داد

ظفر علی کے یہ الفاظ ہیں کہ اُردو میں

ستارہ دار ہے تابانِ تخیّلِ آزاد

مرے کلام سے ہیں آشنا مجاز و ندیم

کہ میرے شعر میں ہے مضطرب مذاقِ جہاد

نئے ادب کی اُمیدیں ہیں مجھ سے وابستہ

نئے ادب کی اُٹھائی ہے مَیں نے یوں بُنیاد

یہاں بُلا کے مجھے یہ سکھا رہے ہو کہ مَیں

کروں انائے جہالت کی بات بات پہ صاد

یہ ہو سکے گا نہ ہرگز کہ خر کو اسپ لکھوں

کروں گا مَیں نہ غرورِ ادب کو یوں برباد
یہاں سے پھر کبھی اپنا کلام نشر کرو
اب اس کے بعد نہ مجھ سے کرو کبھی ارشاد
غیور ہوں تو یہ ذلّت نہ پھر اُٹھاؤں گا
مجھے بُلا کے تو دیکھو کبھی نہ آؤں گا

ایک کتاب کی ضبطی پر

بغاوت کی کتابیں ضبط کر لینے سے کیا ہوگا

کتابوں کا کہاں محتاج ہے جذبہ بغاوت کا
کہ عالمگیر جذبہ آج ہے جذبہ بغاوت کا
بغاوت کارفرما نوجوانوں کے لہو میں ہے
بغاوت آج انسانی ارادوں کے نمو میں ہے

○ انگریز کے دورِ حکومت میں کہی گئی

بغاوت بن رہی ہے، ڈھل رہی ہے کارخانوں میں
جہاں افلاس ڈبتا ہے وطن کے نوجوانوں میں
بغاوت اُگ رہی ہے ملک کے شاداب کھیتوں میں
کساں بھوکا پڑا ہے دیکھ لو سیراب کھیتوں میں
بغاوت پل رہی ہے جھونپڑوں کے اُن اندھیروں میں
کوئی دم میں جنہیں تبدیل ہونا ہے سویروں میں
بغاوت دیکھنا چاہو تو دیکھو ان کے سینوں کو
جو بھوکے رہ کے بھرتے ہیں امیروں کے خزینوں کو
یہ اپنی محفلوں کا رنگ روغن دیکھنے والو
حقیقت کو کبھی سمجھو، حقیقت پر نظر ڈالو
زباں پر ہے جو ہر محفل میں اُس گفتار کو دیکھو
ذرا جاگو خدارا وقت کی رفتار کو دیکھو

سخن آراؤں کی نظموں، ادیبوں کے مقالوں میں
گلی میں، راستے پر، عام انساں کے سوالوں میں
جو سڑکوں ہی پہ ہوتی ہے بسر اُس زندگانی میں
غریبوں کے لڑکپن میں، ضعیفی میں، جوانی میں
دفاتر کے وطیروں، عدل گاہوں کے طریقوں میں
امیری کی بناوٹ میں، غریبی کے سلیقوں میں
جہاں انسان کو ملتا ہے غلہ اُن دکانوں میں
بُنا جاتا ہے کپڑا جس جگہ اُن کارخانوں میں
تعجّب ہے نہیں دیکھا ہے تم نے اضطراب اب تک
زمانہ جاگ اُٹھا ہے اور تم ہو محوِ خواب اب تک

جو کہتے ہیں سکوں ہے ہر طرف باتیں بناتے ہیں

غلط خبریں یہ تنخواہوں کے بدلے میں سُنلتے ہیں

یہ چھوٹے لوگ ہیں ان کے سہارے پر نہ رہ جانا

وہ اک طوفان آتا ہے کہیں اس میں نہ بہ جانا

بتاؤں میں تمہیں کیا عالم بے تاب کا عالم

کہ ہر دل، ہر نظر میں آج ہے سیماب کا عالم

جہاں میں ہر طرف شعلے بھڑکتے دیکھ لو خود ہی

خس و خاشاک کے سینے دھڑکتے دیکھ لو خود ہی

اگر ممکن ہو دیکھو وقت کو، ماحول کو جانو

عجب دھڑکن ہے اس کی زندگی کی نبض پہچانو

غزل

جس کو سمجھا ہے فریبِ آسماں کچھ بھی نہیں
بے خبر یہ گردشِ دَورِ زماں کچھ بھی نہیں

دردِ دوراں آج ہے اے ہمنشیں! معراجِ درد
دردِ جاناں کی یہ کہنہ داستاں کچھ بھی نہیں

آسماں کے اَوج سے افکار کو واپس بُلا
یہ زمیں سب کچھ ہے ناداں آسماں کچھ بھی نہیں

عزم و ہمّت کے کرشمے ہیں یہ اے اہلِ چمن
عزم ہو دل میں تو یہ دَورِ خزاں کچھ بھی نہیں

اہلِ دل ہو اس نئی دُنیا میں یا اہلِ نظر
آج اے اہلِ زباں! اہلِ زباں کچھ بھی نہیں

مختلف پہلو نگاہوں کے ہیں ورنہ اصل میں
یہ خزاں، یہ نو بہاروں کا سماں کچھ بھی نہیں

دیکھ یہ میرا تغزّل اے غزل کے معترض
اب ذرا لہجہ دے یہ اندازِ بیاں کچھ بھی نہیں

روکلا سے پیرس تک

روکلا سے چلا جگمگاتا ہُوا

پرچمِ زندگی

اپنے ماحول سے نُور لیتا ہوا، اپنے ماحول کو نُور دیتا ہُوا

مہر و مہ کی جبینیں جھکاتا ہُوا

اور ذرّوں کو افلاک کی رفعتوں سے ملاتا ہُوا

(راہ میں بزم اپنوں کی ہو یا ہو اغیار کی) بادۂ مہر و اُلفت لُٹاتا ہُوا

روکلا سے چلا جگمگاتا ہُوا ——————— !

روکلا سے چلا پرچمِ عظمتِ زندگی جگمگاتا ہُوا
مسکراتا ہُوا
امن کے آشتی کے دلاویز نغمات گاتا ہُوا

اہلِ دانش کے ہاتھوں نے تھاما اسے
علم والوں نے اس کو سہارا دیا
امن کے حامیوں، جنگ کے دُشمنوں کی حفاظت میں پرچم یہ بڑھتا گیا
روکلا سے چلا وُہ بڈاپیسٹ کو
وہ بڈاپیسٹ مظہر ہے جو نازیوں کی ستمرانیوں کا
آمریت کے احکام پر مٹنے والوں کی سفّاکیوں کا

اور شخصی حکومت پہ جاں دینے والوں کی بے باکیوں کا
وہ اُجڑا ہوا شہر کھنڈروں کی بستی، وہ تاریک بلدہ
اسی ضو فشاں پرچمِ عظمتِ زندگی سے
پھر اک بار یوں جگمگایا
کہ اس پر مہ و مہر اور کہکشاں کی تجلّی کو بھی رشک آیا

پرچمِ عظمتِ زندگی
اس کھنڈر شہر کے
اُجڑے اُجڑے سے ماحول کو زندگی بخشتا
تازگی بخشتا، سرخوشی بخشتا
ارضِ ڈالر کی جانب روانہ ہوا ——
ارضِ ڈالر کہ تاباں تھی ڈالر کی ضو سے

چمک اُٹھی کچھ اور بھی پرچمِ عظمتِ زندگی کی سکوں ریز لَو سے

ارضِ ڈالر میں پہنچا تو یہ پرچمِ عظمتِ زندگی

پھڑ پھڑا کر فضا میں دکھانے لگا

زندگی کی تڑپ

زندگی —— جس کے سینے میں اُمّید ہے

جس کے دل میں عزائم ہیں اور درد ہے

زندگی —— جس کے ہاتھوں میں قوّت ہے اور بازوؤں میں توانائی ہے

زندگی —— جس میں ڈالر سے بڑھ کر ہے تابندگی

زندگی —— جو کبھی ڈالروں کے عوض

آج تک بِک سکی ہے نہ ہی بِک سکے گی

ارضِ ڈالر سے پیرس کی جانب چلا

پرچمِ عظمتِ زندگی

قہقہے ڈالروں پر لگاتا ہُوا

زندگی کے ترانے سُناتا ہوا

کُہنہ عالم کی بنیاد پر عالمِ نو کی محفل سجاتا ہوا

عقل کے دوستوں، ہوش کے ساتھیوں کا سہارا لئے

علم کے حامیوں، جہل کے دُشمنوں کی حفاظت میں بڑھتا ہوا

جا کے یورپ کے اک میکدے میں رُکا

اور گویا ہُوا:—

"میکدہ زندگانی کا ویران ہے

ایک صحرا کی مانند سنسان ہے

میکشو

خواب سے جاگ اُٹھو!

لاؤ گردش میں پیمانۂ زندگی

چھوڑ کر لغو و مہمل فسانوں کو اب

آؤ دُہراؤ افسانۂ زندگی"

زندگی کا یہ پیغام دیتا ہوا

پرچمِ عظمتِ زندگی رنگ و نکہت کی دُنیا سے رُخصت ہُوا

رنگ و نکہت کی دُنیا سے چلنے کے بعد اب کہاں جائے گا

اہلِ عالم ـــــ کہو اب کہاں جائے گا

یہ مرا پرچمِ زندگی

یہ تمہارا، یہ ہم سب کی عظمت کا پرچم

یہ خرد کا، یہ دانش کا، یہ امنِ عالم کا پرچم

اب اسے روئے گیتی پہ لے کر چلو ہر طرف

تاکہ یہ روئے گیتی کی تاریکیوں کو ہٹائے
تاکہ اس کی ضیا سے ہر اک ذرّۂ خاک تاروں سے بھی کچھ فزوں جگمگائے
اس کو پورب میں پچھّم میں لے کر چلو
اس کو اُتّر میں دکھن میں لے کر چلو
تاکہ پورب میں پچھّم میں اُتّر میں دکھن میں یہ مہر و اُلفت کا پیغام دے
تاکہ تشنہ لبوں کو مئے زندگی کا چھلکتا ہوا جام دے
یہ ہمارا تمہارا یہ ہم سب کی عظمت کا پرچم ——— !

غزل

ہوس اور ہے عشق ہے اور شے
وہ بد مستیٔ مے یہ ہے کیفِ مے

ہے زندہ ابھی نامِ فرہاد و قیس
نہ دارا ہے باقی نہ خسرو نہ کے

بڑی بیش قیمت ہے اقلیمِ دل
کہاں دل کی وسعت کہاں روم و رے

نہ مایوس ہو پھر بہار آئے گی
ہُوا کیا چلی آج اگر بادِ دے

پُرانی غزل کے معائب نہ دیکھ
پُرانی غزل میں بھی اک بات ہے

غمِ دوست کے بعد دُنیا کا غم
منازل اسی طرح ہوتی ہیں طے

اب آزاد نغمے کا پہلو بدل
گیا دورِ آہنگ و طنبور و نے

غزل

شب کو تھا دل کا تری یاد میں ایسا عالم
نہ کچھ احساس مسرّت کا نہ احساسِ الم
جو مری رُوح میں اِک آگ لگاتا آیا
درد وُہ پھول پہ اُترا تو برنگِ شبنم
غمِ محبوب تو ہے جان کا آزار مگر
غمِ محبوب سے کچھ کم نہیں احباب کا غم

ایک پل درد تمہارا نہ ہُوا دل سے جُدا
دوستو! مجھ کو مرے حالِ پریشاں کی قسم

باغ کے جسم پہ جو زخم لگائے تُو نے
فصلِ گل! اب تو خزاں اُن پہ لگائے مرہم

شوق ایثار و عمل کا نہ تمہیں ہے نہ ہمیں
اب ہے اس بحث میں کیا، تم ہو خطاوار کہ ہم

اب، جو ممکن ہو تو افسانۂ مزدک بھی سُنا
قصّہ خواں چھوڑ بھی اس دَور میں افسانۂ جم

اے قلمکار ذرا وقت کا فرمان بھی سُن
ٹوٹ تو جائے مگر مُڑ نہ سکے نوکِ قلم

شعر کے نُور سے آزادؔ! ضیا پھیلا دے
ترے ماحول میں ظلمت ہے فزوں، نور ہے کم

اُردو

سرشار کا حُسنِ داستاں ہے اُردو
محروم و فراق کا بیاں ہے اُردو
اُردو کو ملیچھ کیوں سمجھتے ہو تم
چکبست و سُرور کی زباں ہے اُردو

اے اہلِ وطن! یہ داستاں اپنی ہے

اپنی ہے یہ رُوداد، فغاں اپنی ہے
کیوں اس کو مٹا رہے ہو اے دیوانو!
غیروں کی نہیں ہے یہ زباں اپنی ہے

تہذیب سے دعوئے محبّت کیوں ہے
نعروں میں "تحفظِ ثقافت" کیوں ہے
دعوے یہ اگر فقط دکھاوے کے نہیں
پھر اپنی زبان سے یہ نفرت کیوں ہے

اُردو سے یہ فقدانِ محبّت کیوں ہے
اپنی تہذیب سے عداوت کیوں ہے
تھے ہند کا فخر غالب و داغ و انیس

پھر ان کی زباں سے یہ نفرت کیوں ہے

اُردو کو مٹاؤ گے تو مٹ جائے گی
خوشبو یہ فضا کو پھر نہ مہکائے گی
لیکن یہ خبر بھی ہے اے دیوانو!
تہذیب میں کس قدر کمی آئے گی

اُردو ہے فقط زبان کہسار نہیں
اک موجِ شمیم ہے یہ تلوار نہیں
مُشکل نہیں اُردو کا مٹانا، لیکن
کیا اپنے تمدّن سے تمہیں پیار نہیں

پھولوں کو نہ پیروں سے لتاڑو، سنبھلو

پودوں کو نہ اس طرح اُکھاڑو، سنبھلو

اک بار جو اُجڑا تو نہ پھر پھُولے گا

یوں اپنا گلستاں نہ اُجاڑو، سنبھلو

غزل

اپریل ۱۹۵۰ء

سرخروئی کا ہے یہ شوق کہ دنیا نے چمن

آج پھر خونِ بہاراں سے ہوئی سُرخ کفن

پھر وُہ آنکھوں میں لہو بن کے اُتر آئی ہے

کبھی چمکی تھی جو نظروں میں محبّت کی کرن

کب تک اندازِ تباہی کہ چمن میں باقی

اب تو پھولوں کا نہیں نام بھی اے اہلِ چمن

غنچہ و گُل کی جگہ پھوٹ رہے ہیں شعلے
موسمِ گُل! تری ممنون ہے ہر شاخِ چمن

ترے جھونکوں کی طراوت کا سماں کیا کہیئے
تلملا اُٹھی ہیں ارواح جل اُٹھے ہیں بدن

یہ حوادث کا نیا دَور کہاں سے آیا
ہم تو سمجھے تھے کہ اب ختم ہیں ادوارِ فتن

اغوا شدہ عورت کی اپنے محبوب سے ملاقات

امرتا پریتم کی ایک پنجابی نظم کا ترجمہ

یہ ہے وفا کی داستاں

لمبی ادھر ہے داستاں

زخمی ادھر میری زباں —— یہ ہے وفا کی داستاں

دل ہی بچھاؤں آج میں

محبوب! تیری راہ میں

غربت کے گھر میں آج ہے

تیری محبّت میہماں ——— یہ ہے وفا کی داستاں

پکّی ہے پیاروں کی وفا

الفاظ کچّے ہیں مگر

ڈر ہے نہ مجھ سے ہو خفا

میرا یہ عشقِ مہرباں ——— یہ ہے وفا کی داستاں

اپنوں نے پالا ہے اسے

اپنوں نے کھویا ہے اسے

آ دیکھ میرے جسم پر

گریاں ہیں زخموں کے نشاں ——— یہ ہے وفا کی داستاں

محبوبیت کے جسم پر
آ دیکھ لے یہ داغ بھی
داغوں سے کرنا پیار، کچھ
آساں نہیں ہے بیگمیاں ـــــ یہ ہے وفا کی داستاں

تاروں میں اب وُہ لَو نہیں
شب کی گھنی ظلمات سے
پھوٹی ابھی تک پَو نہیں
تو بھی ہے اور میں بھی مگر
تو وُہ نہیں مَیں وہ نہیں
کیونکر سناؤں مَیں اسے
کیونکر سُنے گا تُو اسے

ہے روح کی پاکیزگی
میرا یہ جسم خونچکاں —— یہ ہے وفا کی داستاں

لمبی ہے میری داستاں
مجروح ہے میری زباں
تجھ کو بتائے گی زمیں
تجھ سے کہے گا آسماں —— کیا ہے وفا کی داستاں

جذبۂ عشق

ایک خط کے جواب میں

عشق کی اصل حقیقت نہ سمجھنے والے!

جذبۂ عشق تو ہر پھول میں ہر خار میں ہے
جذبۂ عشق ہے دریاؤں کی موجوں میں رواں
وسعتِ دشت میں ہے، رفعتِ کہسار میں ہے
نگہِ شوق سے دیکھے تو نظر آئے کہ عشق
محفلِ دہر کے ہر ثابت و سیّار میں ہے
برق میں اس کی چمک، ابر میں ہے اس کی گرج

نورؔ اسی کا ہے جو خورشیدِ ضیا بار میں ہے

جذبۂ عشق ہے گاندھی کی خموشی میں نہاں
جذبۂ عشق ہی ٹیگور کی گفتار میں ہے

گفتۂ مارکس کو افکارِ پریشاں نہ سمجھ
جذبۂ عشق ہی خوابیدہ ان افکار میں ہے

شعر سے تجھ کو جو مس ہو تو بتاؤں تجھ کو
کہ یہی شے ہے جو اقبال کے اشعار میں ہے

مجھ کو ہو روح کا احساس تو میں تجھ سے کہوں
کہ یہی نغمہ تری روح کے ہر تار میں ہے

کیا خبر کیا ترے انکار میں پنہاں ہے مگر
جذبۂ عشق ہی آزاد کے اقرار میں ہے

اشعار

یُوں گلستاں میں آئی بادِ نسیم
ہمصفیروں کا ساتھ چھوٹ گیا
مَیں نے پوچھا جو زندگی کیا ہے
ہاتھ سے گِر کے جام ٹوٹ گیا
نوبہاروں کی جب دُعا مانگی
گلستاں کا نصیب پھوٹ گیا

ترے مقام کا جب تک نشاں نہیں ملتا
قرار مجھ کو تہِ آسماں نہیں ملتا

یہ کام کس کا ہے اہلِ چمن کہو تو سہی
چمن میں مجھ کو مرا آشیاں نہیں ملتا

تری تلاش کی منزل ابھی ہے دُور اے دوست!
ابھی تو خود مجھے اپنا نشاں نہیں ملتا

مَیں بُرا بن گیا جہاں اے دوست
تھے کئی میرے ہم زباں اے دوست
اتفاقات ہیں یہ سب ورنہ
تُو کہاں اور مَیں کہاں اے دوست

کس سے پوچھے ترا مقام آزاد
کون جانے ترا نشاں اے دوست

آخر تمہاری بزم میں آنا ضرور کیا
سمجھے نہ تم ہمیں تو ہمارا قصور کیا
محتاجِ کیفِ دل ہے نشہ بھی سرور بھی
دل میں نہ کیف ہو تو نشہ کیا سرور کیا
آؤ ہم اپنے دل کا فسانہ تمہیں سنائیں
حرفِ کلیم و ذکرِ تجلّیٔ طور کیا

تری یاد سے ہوئے محو ہم ترے ذہن سے ہم اُتر گئے
یہی منزلیں تھیں کہ طے ہوئیں یہی مرحلے تھے گزر گئے

جو شہیدِ راہِ وفا ہوئے نہ کہو کہ لوگ وہ مر گئے
اُنہیں زندگی ابد ملی وہ بقا کے گھاٹ اُتر گئے

تو کہاں ہے بادِ خزاں کہ پھر ہے چمن کو تیری ہی جستجو
وہ فضا میں رنگ بکھر گیا وہ زمیں پہ پھول نکھر گئے

ابھی ہے شب کا تسلّط سحر ہے دور ابھی
اندھیری رات میں اے دل سحر تلاش نہ کر
دیارِ دوست کو اب کون جا سکے گا ندیم
دیارِ دوست کی اب رہگذر تلاش نہ کر

فن کار

کیڑے کی طرح خاک کی گہرائی میں نہ جا
شاہیں نہ بن بلندیٔ گردوں کا رُخ نہ کر

تجھ پر زمین کو ہیں اُمیدیں زمیں پہ رہ

ہر وقت قدسیوں سے نہ محوِ کلام ہو
سینے میں ہے ترے کوئی سربستہ راز اگر

وہ راز قدسیوں سے نہ کہہ آدمی سے کہہ

دیکھے اگر جہاں میں بشر کا بشر پہ ظلم
اس کے خلاف اپنا ترانہ بلند کر

اس کو کبھی نہ گردشِ دوراں سمجھ کے سہہ

ساحل پہ زندگی کی تمنّا فضول ہے
گوہر کا شوق لے کے دلِ بحر میں اُتر

مَوجوں کے ساتھ ساتھ نہ پستی کی سمت بہہ

دعوت

حریمِ جاں کی روشنی جو چبھ رہی ہے آنکھ میں
دیا تو بجھ سکے گا کیا حریمِ جاں کو لُوٹ لے
بہار پر تو دسترس مجھے کبھی نہ ہو سکی
بہ ذوق و شوق لُوٹ لے مری خزاں کو لُوٹ لے
سرود مجھ سے چھین لے مرا یہ تجھ میں دم کہاں
یہ اور بات ہے تو میرے آشیاں کو لُوٹ لے

مرتی ہوئی سچائی

زندگی ہے بہت وسیع. بجا ترے دعوے بہت رفیع. بجا

"زندگی بس کہ ہے جلیل و حسیں
یہ فقط اشتراکیت ہی نہیں
زندگی اور بھی بہت کچھ ہے
نغمہ و نالہ سے بھری ہے یہ نَے
اشتراکی نظام کی باتیں

ہم نے مانا ہیں کام کی باتیں
اور مضموں بھی نظم میں لاؤ
اپنی حدِّ نظر کو پھیلاؤ"

مجھ کو اس بات سے نہیں انکار — زندگی بحر ہے بغیر کنار
زندگی اشتراکیت ہی نہیں — اس کی زد میں ہیں آسمان و زمیں
زندگی اور بھی بہت کچھ ہے — نغمہ و نالہ سے بھری ہے یہ نے
لیکن اس بات کو بھی سوچا ہے — وقت بھی تو خود اک تقاضا ہے
جب خزاں وندنائے گلشن میں — ہم بہاروں کے راگ کیوں گائیں
شہر میں آگ جب بھڑک اُٹھے — دل جب انسان کا دھڑک اُٹھے
شہر کیسے بچے یہ فکر کریں — کہ جمالِ شفق کا ذکر کریں
او حقیقت ہی دیکھنی ہو اگر — اس قدر حق پسند ہو جو نظر
تو پھر اس زندگی کے میداں میں — اس نگستاں میں اس بیاباں میں

عزمِ کردار بھی حقیقت ہے　　ذہنِ بیمار بھی حقیقت ہے

گرچہ دونوں حقیقتیں ہیں مگر　　اس سے انکار ہو سکے کیونکر

ایک مرتی ہوئی حقیقت ہے

اک اُبھرتی ہوئی حقیقت ہے

چین

دیکھ شمال کی طرف اے نگہِ نظارہ جُو!
برف ہی برف ہے جہاں تودہ بہ تودہ تُو بہ تُو
اور جنوب کو بھی دیکھ دیدۂ آرزو جہاں
چار طرف ہے جلوہ گر آگ ہی آگ کا سماں
جس کے دُھوئیں میں گم ہُوا زرد ندی کا حسن و رنگ
مَوجِ رواں و کوہسار سب ہیں تہِ سحابِ جنگ

خاک کی صاف سطح پر خورد و کلاں پہاڑیاں
دُور و قریب جس طرح دشت میں فیل ہوں رواں

اے مرے ملکِ دلستاں! رو کشِ اوجِ آسماں
کتنی طرب نواز ہیں تیری حسیں بلندیاں

موسمِ گل میں تو ہے اے مرے دیارِ دل نواز
جیسے حسیں لباس میں کوئی نگارِ دل نواز

تیرے جمیل رودبار، تیرے جلیل کوہسار
تیرے تمام سبزہ زار حُسنِ ازل کے شاہکار

تیرے وقار کے شہید، تیرے جمال کے اسیر
دہر کے مردمِ کبیر بادشہ و وزیر و میر

تیرے شہانِ کجکلاہ داؤ تئی وچائی ہانگ

کم خرد و غلط نگاہ سائی تساؤ، سائی تانگ

اور وہ خان جس کا نام زندہ ہے اب بھی دہر میں

جس کا جواب ہی نہ تھا رعب و جلال و قہر میں

وقت کی ایک موجِ تُند سب کو بہا کے لے گئی

لوحِ جہاں سے اُن کا ہر نقش اُٹھا کے لے گئی

یہ تھے شہانِ تیرہ دل، کم نظر و غلط نگر

اپنی ہی کرّ و فر میں گم، دردِ بشر سے بے خبر

آج مگر گیا وہ دُور آج زمانہ اَور ہے

وقت کے ساز پر رواں آج ترانہ اَور ہے

مدّتِ بے قیاس سے تشنۂ جامِ زندگی

آج ہے تیرے ہاتھ میں تیرا نظامِ زندگی

آج تری زمین پر دورِ عوام آگیا

کہنہ نظام جا چکا، تازہ نظام آگیا

(ماؤزے تنگ کی ایک نظم کا ترجمہ)

غزل

نہ پوچھ مجھ سے مری منزلِ قیام اے دوست!

جنوں رفیق، محبّت مری امام اے دوست!

کسی نے پھر نہ اشارہ کیا ہو یا ہر سے

رُکا ہے دیکھ وہ گردش میں آ کے جام اے دوست!

تجھے بھلا نہ سکوں تجھ کو یاد رکھ نہ سکوں

یہ راہِ عشق میں آیا عجب مقام اے دوست!

نہ مل سکا تو، اب اس کے سوا میں کیا سمجھوں
کہ دل میں تیری تمنّا ابھی ہے خام اے دوست!
گداز دل کا کبھی لب پہ آ کے نالہ بنے
یہ بات شرعِ محبّت میں ہے حرام اے دوست!
بساطِ کہنۂ عالم اُلٹنے والی ہے
مرا نہیں ہے یہ ہے وقت کا پیام اے دوست!
غمیں نہ ہو کہ ہمیشہ بدل کے رہتی ہے
برنگِ صبحِ درخشاں ہر ایک شام اے دوست!

سورج اور تارے

نئے خورشید سے یوں ڈوبتے تاروں نے کہا

ہم بہت چمکے مگر تیری ضیا کم نہ ہوئی

ہم نے مِل جُل کے بہت زور لگایا، لیکن

زلفِ پُر نور تری ہم سے تو برہم نہ ہوئی

مسکراتے ہوئے سورج نے دیا ان کو جواب

جنگ مجھ سے نہ کرو میرے مقابل نہ تنو

دورِ پُر نُور میں جینے کی تمنّا ہے اگر

مرے انوار میں گم ہو کے مرا جزو بنو

ایک شعر

زمیں سے دُور تاروں پر نگاہیں ڈالنے والے

خبر بھی ہے کہ یہ خاکی کرہ بھی اک ستارہ ہے

— "گورکی"

لکھنؤ کا ایک مشاعرہ

گُم مرے شعر میں ہے بزم، مگر کیا کہئے

جا کے ٹھہرا ہے کہاں ذوقِ نظر کیا کہئے

اُف وُہ ترشے ہوئے ہونٹوں پہ تبسّم کی لکیر

ہائے اُن مست نگاہوں کا اثر کیا کہئے

وُہ اُمنڈتی ہوئی بدمست گھٹائیں توبہ

اُف وُہ پاکیزگیٔ حُسنِ سحر کیا کہئے

مرے احساس پہ یہ نور کہاں سے برسا
بند کمرے میں یہ انوارِ قمر، کیا کہیے

کون یہ عشق کے نالوں پہ تڑپ اُٹھا ہے
عشق کا اوج ہے یا اوج — مگر کیا کہیے

جس کے نغمات میں گم بزم ہے، وہ خود ہے کہاں
نہیں احساس کو اتنی بھی خبر کیا کہیے

برف باری میں کہ بستر سے نکلنا تھا محال
مجھ کو لایا ہے کہاں ذوقِ سفر، کیا کہیے

اب یہ افسانۂ مجروح سناؤں کس کو
ہائے یہ سلسلۂ قلب و نظر کیا کہیے

اب یہ رُودادِ جنوں خیز کہاں لے جاؤں

عالمِ شوق ہے کیوں زیر و زبر، کیا کہیئے
محفلِ شعر کو جب لوٹ رہا تھا کوئی
لُٹ گیا خود وہ سرِ راہگذر، کیا کہیئے

جسم اور رُوح

ایک دوست کے نام جس نے دہلی میں جسم فروشی کیخلاف مہم جاری کر رکھی ہے

مضطرب ہے جسم کے سودوں پہ تو اے ہم نشیں
رُوح کے سودوں پہ کیوں تجھ کو قلق ہوتا نہیں

مَیں نے مانا جسم کا سودا ہے ابلیسی شعار
رُوح کے سودے میں کیا پنہاں ہے انساں کا وقار

جسم کا سودا یہ مانا پیکرِ تہذیب پر
ہے وہ پھوڑا زہر سے کچھ کم نہیں جس کا اثر

گُم ہے اِن سودوں میں یہ نانا تمدّن کا سُراغ
ہند کی تہذیب کے ماتھے پہ ہے یہ ایک داغ

رُوح کے سودے بھی لیکن کم نہیں کچھ زہرناک
یہ بھی کر دیتے ہیں آخر آدمیّت کو ہلاک

جسم کے سودوں سے کچھ سودے یہ کم مہلک نہیں
یہ بھی ہیں باطن میں گندے اور ظاہر میں حسیں

رُوح کا سودا وہ لعنت ہے کہ جو اس دیس میں
بھیڑیا ہے، پھر رہا ہے آدمی کے بھیس میں

بے خبر ہے تو کہ لاکھوں ہیں یہاں ایسے لعیں
بیچ کھاتا حُرمتِ قوم و وطن ہے جن کا دیں

اے کہ ہیں تیری نگاہیں جسم کی میزان پہ

کیا نہیں ہے تجھ کو روحوں کی تجارت کی خبر
رُوح کے سودوں کی منڈی پر ذرا ڈال اک نظر
جنس کو دیکھ اور اُس کے بھاؤ کا نظّارہ کر
بیچ دیتے ہیں وطن کو بیچنے والے یہاں
دیکھ ہیں کس رنگ میں آفت کے پرکالے یہاں
عندلیبوں کے جو بس میں ہو گلستاں بیچ دیں
اس مکے اُلّو آپ ہی اپنا بیاباں بیچ دیں
اشرف المخلوق ہے یا ہے کوئی کرمِ حقیر
بک رہا ہے کس طرح سے آدمیّت کا ضمیر
دوستوں کے زانو بک جاتے ہیں یہ منڈی ہے وہ
ہمدم و دمساز بک جاتے ہیں یہ منڈی ہے وُہ
بے حیائی ہے یہاں، ذلّت یہاں، خواری یہاں

پرورش پاتی ہے دُنیا بھر کی غدّاری یہاں
اس پہ بھی ایسا ملمع ہے کہ دھوکا کھا ہی جائیں
دیکھنے والے اگر دیکھیں بظاہر کچھ نہ پائیں

جسم کے اور رُوح کے سودوں کا فرق اتنا ہے بس
ناشنیدہ ایک نالہ، ایک فریادِ جرس
جسم کے سودے تو آجاتے ہیں خود نظروں کے پاس
رُوح کے سودے چھپا لیتا ہے ظاہر کا لباس

جسم بھی بازار میں ہے رُوح بھی بازار میں
گر چکا ہے آدمی پندار میں، کردار میں
جسم مشکل میں اگر ہے رُوح بھی مشکل میں ہے
آج دونوں کا مُقدّر ایک ہی منزل میں ہے

جسم بھی ماتم کناں ہے رُوح بھی ماتم کناں
الاماں و الحفیظ و الحفیظ و الاماں

جسم اگر ہے نالہ کش، مضطر نہ ہوں، ماتم گسار
دامنِ صبر و سکوں ہے رُوح کا بھی تار تار

دیکھ کر رُوحِ بشر کو اس طرح خوار و حزیں
کیوں ترے دل سے صدائے دردناک اُٹھتی نہیں

کیا کہوں میں رُوح کے سَودوں کا تخریبی اثر
اس کے شعلے راکھ کر دیتے ہیں ہر طائر کے پر

طائرِ گفتار ہو یا طائرِ پندار ہو
طائرِ کردار ہو یا طائرِ افکار ہو

ریزہ ریزہ اس کی یورش سے شرافت کی چٹان
خاک کی ہمپایہ اس سے ہے بشر کی آن بان

شیشۂ انسانیت ہے اس کی زد سے پاش پاش
اب کہاں تک میں لکھوں یہ داستاں ہے، دل خراش
تجھ کو اس کے بھی خلاف آواز کرنا ہے بلند
نالہ کش ہے درد سے انسانیت کا بند بند

رباعیات

اے منظرِ بیقرار دم بھر تو ٹھہر
اے جلوۂ نو بہ نو نگار دم بھر تو ٹھہر
جی بھر کے میں اک بار تجھے دیکھ تو لوں
اے قافلۂ بہار دم بھر تو ٹھہر

ماحول ہے روشنی لٹانے والا
تاریک کمرہ ہے جگمگانے والا
جو دورِ نشاط ہے تری نظروں میں
وہ دورِ نشاط ہے اب آنے والا

اشعار پہ اشعار چلے آتے ہیں
افکار پہ افکار چلے آتے ہیں
یہ کس نے اُٹھا دیا نگاہوں سے حجاب
کھلتے ہوئے اسرار چلے آتے ہیں

غزل

غمِ دوراں غمِ جاناں کا بدل ہے کہ نہیں
اس میں بھی تاب و تبِ سوزِ ازل ہے کہ نہیں
محفلِ شعر میں کل تک جو رہی ہے ممنوع
آج اُس تلخ کلامی کا محل ہے کہ نہیں
جو حدودِ غمِ جاناں سے پرے جا نہ سکے
آج اُس ذہن میں اے دوست! خلل ہے کہ نہیں

11605

علمِ افکار زمانے میں بڑا علم سہی
علم ہر دور میں محتاجِ عمل ہے کہ نہیں

جس نے اس دور میں مجبور کا خوں گرمایا
وہ ہنر مسئلۂ دہر کا حل ہے کہ نہیں

اُڑ سکے عرش پہ جو، خاک پہ جو چل نہ سکے
آج اُس فکر میں تقصیر و کسل ہے کہ نہیں

موت اور اُس کے عواقب سے ڈرانے والے
موت کی طرح غمِ زیست اٹل ہے کہ نہیں

جس کو تو زہر سمجھتا ہے ادب کے حق میں
وہ مرے شعر میں تریاق و عسل ہے کہ نہیں

اے غزل کو غمِ محبوب سمجھنے والے!
یہ جو اب میں نے سنائی ہے غزل ہے کہ نہیں